Registered No. L. 4186

جلد ۱۶ — عدد ۱

محرم ۱۳۵۹ھ

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت سالانہ صہ

قیمت فی پرچہ ۸ر

اطلاع

ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ کی اشاعت میں کتاب "پردہ" کا پہلا حصہ شائع ہوچکا ہے
اور اس اشاعت میں اسکا دوسرا حصہ پیش کیا جا رہا ہے، آئندہ ماہ صفر کے
پرچہ میں انشاءاللہ یہ کتاب مکمل ہو جائیگی، انگریزی تہذیب و تمدن کے حاکمانہ تسلط اور
فرنگیت مآب لیڈروں کے برسراقتدار ہونے کیوجہ سے تبرج جاہلیت کی وبا جس تیزی
کے ساتھ پھیل رہی ہے اور اسکے جو افسوسناک مظاہر مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کے
موقع پر دیکھے گئے ہیں انکی بنا پر یہ ضروری سمجھا گیا کہ تمام دوسرے مباحث کو ملتوی
کر کے پردہ کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کو پوری شرح و بسط کے ساتھ پیش کر دیا جائے
لہٰذا ہمیں امید ہے کہ ایک پوری کتاب کو رسالہ میں باقساط شائع کرنے کی جس بدعت
کا ارتکاب کیا گیا ہے، ناظرین کرام ضرورت وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو
بدعت حسنہ تسلیم کرینگے ٭

یہ کتاب علیحدہ بھی شائع کیجا رہی ہے اور اسکی قیمت ایکروپیہ علاوہ محصولڈاک ہے

دو جدید کتابیں

۱- مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے مضامین متعلقہ قرآن و حدیث جنکی علمی
طبقہ میں بہت زیادہ مانگ تھی الحمدللہ کتابی شکل میں تفہیمات کے نام سے طبع ہو کر
آگئے ہیں۔ یہ کتاب ٥٠٢ صفحات پر مشتمل ہے قیمت بیجلد ایکروپیہ آٹھ آنے

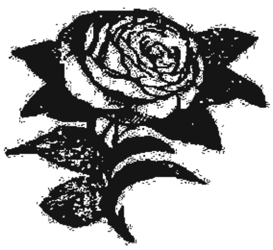
۲- Towards Understanding Islam یہ کتاب مولانا نے موصوف کے اردو
رسالہ دینیات کا انگریزی میں ترجمہ ہے جو حضرات اردو کی نسبت انگریزی کو زیادہ
آسانی سے سمجھتے ہیں، اُن کے لئے یہ کتاب بہت زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ علاوہ ازیں
جو حضرات غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کرنا چاہیں آنکے لئے اس موضوع پر اس سے
بہتر کتاب کا ملنا دشوار ہے قیمت مجلد ایکروپیہ آٹھ آنے محصولڈاک آٹھ آنے

مینیجر رسالہ ترجمان القرآن لاہور

رسالہ **ترجمان القرآن** ماہوار

فہرست مضامین

جلد ۱۶	ماہ محرم ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۰ء	عدد ۱



باہتمام ابو الاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس، سرکلر روڈ، لاہور میں طبع ہوکر دفتر ترجمان القرآن، مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور سے شائع ہوا

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

حصّہ اوّل

اِسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں

ایک روپے میں	۵ نسخے	علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں	۵۰ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپے میں	۱۰۰ نسخے	

حصّہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصُول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:-

۲ روپے ۴ آنہ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۵ نسخے
محصول ڈاک بذمہ خریدار

۱۱ روپے ۸ آنہ میں	۲۵ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار
۲۲ روپے میں	۵۰ نسخے	
۴۰ روپے میں	۱۰۰ نسخے	

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

قوانین فطرت

فطرت نے تمام انواع کی طرح انسان کو بھی "زوجین"، یعنی دو ایسی صنفوں کی صورت میں پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی جانب طبعی میلان رکھتی ہیں۔ مگر دوسری انواع حیوانی کا جس حد تک مطالعہ کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں اس صنفی تقسیم اور اس طبعی میلان کا مقصد محض بقائے نوع ہے، اسی لیے ان میں یہ میلان صرف اُس حد تک رکھا گیا ہے جو ہر نوع کے بقا کے لیے ضروری ہے، اور انکی جبلّت میں ایسی قوت ضابطہ رکھ دی گئی ہے جو انہیں صنفی تعلق میں اُس حدِ مقرر سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ اسکے برعکس انسان میں یہ میلان غیر محدود، غیر منضبط اور تمام دوسری انواع سے بڑھا ہوا ہے۔ اُسکے لیے وقت اور موسم کی کوئی قید نہیں۔ اسکی جبلّت میں کوئی ایسی قوتِ ضابطہ بھی نہیں جو اسے کسی حد پر روک دے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کی طرف دائمی میلان رکھتے ہیں۔ انکے اندر ایک دوسرے کی طرف جذب و انجذاب اور صنفی کشش کے غیر محدود اسباب فراہم کیے گئے ہیں۔ انکے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا ایک زبردست داعیہ رکھا گیا ہے۔ اُنکے جسم کی ساخت، اور اس کے تناسب، اور اسکے رنگ روپ، اور اسکے لمس، اور اسکے ایک ایک جزو میں صنف مقابل کے لیے کشش پیدا کر دی گئی ہے۔ انکی آواز، رفتار، انداز و ادا، ہر ایک چیز میں کھینچ لینے کی قوت بھر دی گئی ہے۔ اور گرد و پیش کی دنیا میں بھی بیشمار ایسے اسباب پھیلا دیئے گئے ہیں جو دونوں کے داعیات صنفی کو حرکت میں لاتے اور انھیں ایک دوسرے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ہوا کی سرسراہٹ، پانی کی روانی، سبزہ کا رنگ، پھولوں کی خوشبو، پرندوں کے چہچہے، فضا کی گھٹائیں، شبِ ماہ کی لطافتیں، غرض جمالِ فطرت کا کوئی منظر اور حسنِ کائنات کا کوئی جلوہ ایسا نہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس تحریک کا

سبب نہ بنتا ہو۔

پھر انسان کے نظام جسمانی کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اُس میں طاقت کا جو زبردست خزانہ رکھا گیا ہے وہ بیک وقت قوتِ حیات اور قوتِ عمل بھی ہے، اور صنفی تعلق کی قوت بھی۔ وہی غدود (glands) جو اُسکے اعضاء کو جیون رس (Harmon) بہم پہنچاتے ہیں، اور اُس میں چستی، توانائی، ذہانت اور عمل کی طاقت پیدا کرتے ہیں، انہی کے سپرد یہ خدمت بھی کی گئی ہے کہ اس میں صنفی تعلق کی قوت پیدا کریں، اس قوت کو حرکت میں لانے والے جذبات کو نشو و نما دیں، ان جذبات کو ابھارنے کے لیے حسن اور روپ اور نکھار اور پھبن کے گوناگوں آلات بہم پہنچائیں، اور ان آلات سے متاثر ہونے کی قابلیت اُسکی آنکھوں اور اُسکے کانوں اور اُسکی شامّہ اور لامسہ، حتّٰی کہ اسکی قوت متخیلہ تک میں فراہم کر دیں۔

قدرت کی یہی کارفرمائی انسان کے قوائے نفسانی میں بھی نظر آتی ہے۔ اسکے نفس میں جتنی محرک قوتیں پائی جاتی ہیں ان سب کا رشتہ دو زبردست داعیوں سے ملتا ہے۔ ایک وہ داعیہ جو اسے خود اپنے وجود کی حفاظت اور اپنی ذات کی خدمت پر ابھارتا ہے۔ دوسرا وہ داعیہ جو اسکو اپنے مقابل کی صنف سے تعلق پر مجبور کرتا ہے۔ شباب کے زمانہ میں، جبکہ انسان کی عملی قوتیں اپنے پورے عروج پر ہوتی ہیں یہ دوسرا داعیہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ بسا اوقات پہلے داعیہ کو دبا لیتا ہے اور اسکے اثر سے انسان اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی جان تک دیدینے اور اپنے آپکو جانتے بوجھتے ہلاکت میں ڈال دینے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔

تمدن کی تخلیق میں صنفی کشش کا اثر | یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ کیا محض بقائے نوع کے لیے؟ نہیں کیونکہ نوع انسانی کو باقی رکھنے کے لیے اُس قدر تناسل کی بھی ضرورت نہیں ہے جسقدر مچھلی اور بکری اور ایسی ہی دوسری انواع کے لیے ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ فطرت نے ان سب انواع سے زیادہ صنفی میلان انسان میں رکھا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ اسباب تحریک فراہم کیے ہیں؟ کیا یہ محض انسان کے لطف اور لذت کے لیے ہے؟ یہ بھی نہیں۔ فطرت نے کہیں بھی لطف اور لذت کو مقصود بالذات نہیں بنایا ہے وہ

تو کسی بڑے مقصد کی خدمت پر انسان اور حیوان کو مجبور کرنے کے لیے لطف اور لذت کو محض چاشنی کے طور پر لگا دیتی ہے تاکہ وہ اس خدمت کو غیر کا نہیں بلکہ اپنا کام سمجھ کر انجام دیں۔ اب غور کیجیے کہ اس معاملہ میں کونسا بڑا مقصد فطرت کے پیش نظر ہے؟ آپ جتنا غور کریں گے کوئی اور وجہ اسکے سوا سمجھ میں نہ آئیگی کہ فطرت، دوسری تمام انواع کے بخلاف، نوع انسانی کو متمدن بنانا چاہتی ہے۔

اسی لیے انسان کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا جو داعیہ رکھا گیا ہے وہ محض جسمانی اتصال اور فعل تناسل ہی کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ ایک دائمی معیت اور قلبی وابستگی اور روحانی لگاؤ کا مطالبہ کرتا ہے۔

اسی لیے انسان میں صنفی میلان، اسکی واقعی قوت مباشرت سے بہت زیادہ رکھا گیا ہے۔ اس میں جتنی خواہش اور جتنی صنفی کشش رکھی گئی ہے، اگر اسی نسبت سے، بلکہ ایک اور دس کی نسبت سے بھی وہ فعل تناسل کا ارتکاب کرے تو اسکی صحت جواب دے دے، اور عمر طبعی کو پہنچنے سے پہلے ہی اسکی جسمانی قوتیں ختم ہو جائیں۔ یہ بات اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ انسان میں صنفی کشش کی زیادتی کا مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ تمام حیوانات سے بڑھ کر صنفی عمل کرے، بلکہ اس سے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنا اور انکے باہمی تعلق میں استمرار و استقلال پیدا کرنا ہے۔

اسی لیے عورت کی فطرت میں صنفی کشش اور صنفی خواہش کے ساتھ ساتھ شرم و حیا اور تمنع اور فرار اور رکاوٹ کا مادّہ رکھا گیا ہے جو کم و بیش ہر عورت میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرار اور منع کی کیفیت اگرچہ دوسرے حیوانات کے اناث میں بھی نظر آتی ہے، مگر انسان کی صنف اناث میں اسکی قوت و کمیت بہت بڑھی ہوئی ہے اور اسکو جذبۂ شرم و حیار کے ذریعہ سے اور زیادہ شدید کر دیا گیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں صنفی مقناطیسیت کا مقصد ایک مستقل وابستگی ہے، نہ یہ کہ ہر صنفی کشش ایک صنفی عمل پر منتج ہو۔

اسی لیے انسان کے بچے کو تمام حیوانات کے بچوں سے زیادہ کمزور اور بے بس پیدا کیا گیا ہے۔ بخلاف دوسرے حیوانات کے انسان کا بچہ کئی سال تک ماں باپ کی حفاظت اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے اور اس

میں اپنے کو سنبھالنے اور اپنی مدد آپ کرنے کی قابلیت بہت دیر میں پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بھی یہ مقصود ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق محض تعلق صنفی کی حد تک نہ رہے بلکہ اس تعلق کا نتیجہ انکو باہمی تعاون اور تعامل پر مجبور کر دے۔

اسی لیے انسان کے دل میں اولاد کی محبت تمام حیوانات سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ حیوانات ایک قلیل مدت تک اپنے بچوں کی پرورش کرنے کے بعد ان سے الگ ہو جاتے ہیں، پھر ان میں کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، بلکہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں۔ بخلاف اسکے انسان ابتدائی پرورش کا زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اولاد کی محبت میں گرفتار رہتا ہے، تمام عمر گرفتار رہتا ہے، حتی کہ یہ محبت اولاد کی اولاد تک منتقل ہوتی ہے، اور انسان کی خود غرض حیوانیت اس محبت کے اثر سے اس درجہ مغلوب ہو جاتی ہے کہ وہ جو کچھ اپنی ذات کے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ اپنی اولاد کے لیے چاہتا ہے، اور اسکے دل میں اندر سے یہ امنگ پیدا ہوتی ہے کہ اپنی حدِ امکان تک اولاد کے لیے بہتر سے بہتر اسباب زندگی بہم پہنچائے اور اپنی محنتوں کے نتائج اُن کے لیے چھوڑ جائے۔ اس شدید جذبۂ محبت کی تخلیق سے فطرت کا مقصد صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق کو ایک دائمی رابطہ میں تبدیل کر دے، پھر اس دائمی رابطہ کو ایک خاندان کی ترکیب کا ذریعہ بنائے، پھر خونی رشتوں کی محبت کا سلسلہ بہت سے خاندانوں کو مصاہرت کے تعلق سے مربوط کرتا چلا جائے، پھر محبتوں اور محبوبوں کا اشتراک انکے درمیان تعاون اور معاملت کا تعلق پیدا کر دے، اور اس طرح ایک نظام تمدن وجود میں آ جائے۔

تمدن کا بنیادی مسئلہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ صنفی میلان جو انسانی جسم کے ریشے ریشے اور اسکے قلب و روح کی گوشے گوشے میں رکھا گیا ہے، اور جسکی مدد کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر کائنات کے چپے چپے میں اسباب و محرکات فراہم کیے گئے ہیں، اسکا مقصد انسان کی انفرادیت کو اجتماعیت کی طرف مائل کرنا ہے۔ فطرت نے اس میلان کو تمدن انسانی کی اصلی قوت محرکہ بنایا ہے۔ اسی میلان و کشش کے ذریعہ سے نوع انسانی کی دونوں صنفوں میں وابستگی پیدا ہوتی ہے اور پھر اس وابستگی سے اجتماعی زندگی (Social life) کا آغاز ہوتا ہے۔

جب یہ امر متحقق ہو گیا، تو یہ بات بھی آپ سے آپ ظاہر ہو گئی کہ عورت اور مرد کے تعلق کا مسئلہ دراصل

تمدن کا بنیادی مسئلہ ہے اور اسی کے صحیح حل پر تمدن کی صلاح و فساد اور اسکی بہتری و بدتری، اور اسکے استحکام و ضعف کا انحصار ہے۔ نوع انسانی کے ان دونوں حصوں میں ایک تعلق حیوانی (یا بالفاظ دیگر خالص صنفی اور سراسر شہوانی) ہے جس کا مقصود بقائے نوع کے سوا کچھ نہیں۔ اور دوسرا تعلق انسانی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں مل کر مشترک اغراض کے لیے اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق تعاون کریں۔ اس تعاون کے لیے انکی صنفی محبت ایک واسطۂ اتصال کے طور پر کام دیتی ہے، اور یہ حیوانی و انسانی عناصر، دونوں مل کر بیک وقت اُن سے تمدن کا کاروبار چلانے کی خدمت بھی لیتے ہیں اور اس کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے مزید افراد فراہم کرنے کی خدمت بھی۔ تمدن کی صلاح و فساد کا مدار اس پر ہے کہ ان دونوں عناصر کا امتزاج نہایت متناسب اور معتدل ہو۔

مدنیت صالحہ کے لوازم

آیئے اب ہم اس مسئلہ کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کریں کہ ایک صالح تمدن کے لیے عورت اور مرد کے حیوانی اور انسانی تعلق میں معتدل اور متناسب امتزاج کی صورت کیا ہے اور اس امتزاج پر بے اعتدالی کی کن کن صورتوں کے عارض ہونے سے تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔

(۱)

میلان صنفی کی تعدیل سب سے اہم اور مقدم سوال خود اس صنفی کشش اور میلان کا ہے کہ اسکو کس طرح قابو میں رکھا جائے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ انسان کے اندر یہ میلان تمام حیوانات سے زیادہ طاقت ور ہے۔ نہ صرف یہ کہ انسانی جسم کے اندر صنفی تحریک پیدا کرنے والی قوتیں زیادہ شدید ہیں بلکہ باہر بھی اس وسیع کائنات میں ہر طرف بے شمار صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ چیز جس کے لیے فطرت نے خود ہی اتنے انتظامات کر رکھے ہیں، اگر انسان بھی اپنی توجہ اور قوت ایجاد سے کام لے کر اس کو بڑھانے اور ترقی دینے کے اسباب مہیا کرنے لگے، اور

ایسا طرزِ تمدن اختیار کرے جس میں اسکی صنفی پیاس بڑھتی چلی جائے، اور پھر اس پیاس کو بجھانے کی آسانیاں بھی پیدا کی جاتی رہیں، تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ حدِ مطلوب سے بہت زیادہ متجاوز ہو جائیگی، انسان کا حیوانی عنصر اسکے انسانی عنصر پر پوری طرح غالب ہو جائیگا اور یہ حیوانیت اسکی انسانیت اور اسکے تمدن دونوں کو کھا جائیگی۔

صنفی تعلق اور اسکے مبادی اور محرکات میں سے ایک ایک چیز کو فطرت نے لذیذ بنایا ہے، مگر جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، فطرت نے یہ لذت کی چاٹ محض اپنے مقصد یعنی تعمیرِ تمدن کے لیے لگائی ہے۔ اس چاٹ کا حد سے بڑھ جانا اور اسی میں انسان کا منہمک ہو جانا نہ صرف تمدن بلکہ خود انسان کی بھی تخریب و ہلاکت کا موجب ہو سکتا ہے، ہو رہا ہے، اور بارہا ہو چکا ہے۔ جو قومیں تباہ ہو چکی ہیں ان کے آثار اور ان کی تاریخ کو دیکھیے، شہوانیت ان میں حد سے متجاوز ہو چکی تھی۔ انکے لٹریچر اسی قسم کے ہیجان انگیز مضامین سے لبریز پائے جاتے ہیں۔ انکے تخیلات، انکے افسانے، انکے اشعار، انکی تصویریں، انکے مجسمے، انکے عبادت خانے انکے محلات سب کے سب اس پر شاہد ہیں۔ جو قومیں اب تباہی کی طرف جا رہی ہیں انکے حالات بھی دیکھ لیجیے وہ اپنی شہوانیت کو آرٹ، اور ادبِ لطیف، اور ذوقِ جمال اور ایسے کتنے ہی خوشنما اور معصوم ناموں سے موسوم کریں، مگر تعبیر کے بدل جانے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ یہ کیا چیز ہے کہ سوسائٹی میں عورت کو عورتوں سے زیادہ مرد کی صحبت اور مرد کو مردوں سے زیادہ عورت کی معیت مرغوب ہے؟ یہ کیوں ہے کہ عورتوں اور مردوں میں تزئین و آرائش کا ذوق بڑھتا چلا جا رہا ہے؟ اسکی کیا وجہ ہے کہ مخلوط سوسائٹی میں عورت کا جسم لباس سے باہر ہوا جاتا ہے؟ وہ کون سی شے ہے جسکے سبب سے عورت اپنے جسم کے ایک ایک حصے کو کھول کھول کر پیش کر رہی ہے اور مردوں کی طرف سے ہل من مزید کا تقاضا ہے؟ اسکی کیا علت ہے کہ برہنہ تصویریں، ننگے مجسمے اور عریاں ناچ سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں؟ اس کا کیا سبب ہے کہ سینما میں اُس وقت تک لطف ہی نہیں آتا جب تک کہ عشق و محبت کی چاشنی نہ ہو اور اس پر صنفی تعلقات کے بہت سے قولی اور فعلی

مبادی کا اضافہ نہ کیا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے مظاہر اگر شہوانیت کے مظاہر نہیں تو کس چیز کے ہیں؟ جس تمدن میں ایسا غیر معتدل شہوانی ماحول پیدا ہو جائے اسکا انجام تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایسے ماحول میں صنفی میلان کی شدت، اور پیہم ہیجان، اور مسلسل تحریک کی وجہ سے ناگزیر ہے کہ نسلیں کمزور ہو جائیں، جسمانی اور عقلی قوتوں کا نشوونما بگڑ جائے، قوائے ذہنی پراگندہ ہو جائیں[1]، فواحش کی کثرت ہو، امراض خبیثہ کی وبائیں پھیلیں، منع حمل اور اسقاط حمل اور قتل اطفال جیسی تحریکیں وجود میں آئیں، مرد اور عورت بہائم کی طرح ملنے لگیں، بلکہ فطرت نے انکے اندر جو صنفی میلان تمام حیوانات سے بڑھ کر رکھا ہے اسکو وہ مقاصد فطرت کے خلاف استعمال کریں اور اپنی بہیمیت میں تمام حیوانات سے بازی لے جائیں، حتی کہ بندروں اور بکروں کو بھی مات کر دیں۔ لامحالہ ایسی شدید حیوانیت انسانی تمدن و تہذیب بلکہ خود انسانیت کو بھی غارت کر دے گی اور جو لوگ اس میں مبتلا ہونگے ان کا اخلاقی انحطاط ان کو ایسی پستی میں گرائے گا جہاں سے وہ پھر کبھی نہ اٹھ سکیں گے۔

---

[1] ایک ڈاکٹر لکھتا ہے: "بلوغ کے آغاز کا زمانہ بڑے اہم تغیرات کے ساتھ آتا ہے۔ نفس اور جسم کے مختلف افعال میں اس وقت ایک انقلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور تمام حیثیتوں سے عام نشوونما ہوتا ہے۔ آدمی کو اس وقت ان تغیرات کو برداشت کرنے اور اس نشوونما کو حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام قوت درکار ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بیماریوں کے مقابلہ کی طاقت اس زمانہ میں آدمی کے اندر بہت کم ہوتی ہے .... عام نشوونما، اعضا کی ترقی، اور نفسی و جسمانی تغیرات کا یہ طویل عمل جسکے بعد آدمی بچہ سے جوان بنتا ہے، ایک ایسا تھکا دینے والا عمل ہے جسکے دوران میں طبیعت انتہائی جدوجہد میں مصروف ہوتی ہے۔ اس حالت میں اس پر کوئی غیر معمولی بار ڈالنا جائز نہیں، خصوصاً صنفی عمل اور شہوانی ہیجان تو اس کے لیے تباہ کن ہے۔"

Sensations
ایک مشہور جرمن عالم نفسیات و عمرانیات لکھتا ہے: "صنفی اعضاء کا تعلق چونکہ لذت اور جوش کے غیر معمولی ہیجانات (Sensations) کے ساتھ ہے اسوجہ سے یہ اعضاء ہماری ذہنی قوتوں میں سے ایک بڑا حصہ اپنی طرف جذب کر لینے، یا بالفاظ دیگر ان پر ڈاکہ مار دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اگر انہیں غلبہ حاصل ہو جائے تو یہ آدمی کو تمدن کی خدمت کے بجائے انفرادی لطف اندوزی میں منہمک کر دیں۔ یہ طاقتور پوزیشن جو ان کو جسم انسانی میں حاصل ہے، آدمی کی صنفی زندگی کو ذرا سی غفلت میں حالت اعتدال سے بے اعتدالی کی طرف لے جا کر مفید سے مضر بنا سکتی ہے۔ تعلیم کا اہم ترین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس خطرے کی روک تھام کی جائے۔"

ایسا ہی انجام اُس تمدن کا بھی ہوگا جو تفریط کا پہلو اختیار کریگا۔ جسطرح صنفی میلان کو حدِ اعتدال سے بڑھانا مضر ہے اُسی طرح اُسکو حد سے زیادہ دبانا اور کچل دینا بھی مضر ہے۔ جو نظام تمدن انسان کو سنیاس اور برہمچریہ اور رہبانیت کی طرف لیجانا چاہتا ہے وہ فطرت سے لڑتا ہے، اور فطرت اپنے مقابل سے کبھی شکست نہیں کھاتی بلکہ خود اسی کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ خالص رہبانیت کا تصور تو ظاہر ہے کہ کسی تمدن کی بنیاد بن ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ دراصل تمدن و تہذیب کی نفی ہے۔ البتہ راہبانہ تصورات کو دلوں میں راسخ کر کے نظام تمدن میں ایک ایسا غیر صنفی ماحول ضرور پیدا کیا جا سکتا ہے جس میں صنفی تعلق کو بذاتِ خود ایک ذلیل، قابلِ نفرت اور گھناؤنی چیز سمجھا جائے، اس سے پرہیز کرنے کو معیارِ اخلاق قرار دیا جائے، اور ہر ممکن طریقے سے اس میلان کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ مگر صنفی میلان کا دبنا دراصل انسانیت کا دبنا ہے۔ وہ اکیلا نہیں دبے گا بلکہ اپنے ساتھ انسان کی ذہانت، اور قوتِ عمل اور عقلی استعداد، اور حوصلہ و عزم، اور ہمت و شجاعت سب کو لیکر دب جائیگا۔ اسکے دبنے سے انسان کی ساری قوتیں ٹھٹھر کر رہ جائیگی، اسکا خون سرد اور منجمد ہو جائیگا، اُس میں ابھرنے کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہیگی۔ کیونکہ انسان کی سب سے بڑی محرک طاقت یہی صنفی طاقت ہے

پس صنفی میلان کو افراط و تفریط سے روک کر توسط و اعتدال کی حالت پر لانا اور اسے ایک مناسب ضابطہ سے منضبط (regulate) کرنا ایک صالح تمدن کا اولین فریضہ ہے۔ اجتماعی زندگی کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ایک طرف غیر معتدل (Abnormal) ہیجان و تحریک کے اُن تمام اسباب کو روک دے جنکو انسان خود اپنے ارادے اور اپنی لذت پرستی سے پیدا کرتا ہے، اور دوسری طرف فطری (Normal) ہیجانات کی تسکین و تشفی کے لیے ایسا راستہ کھول دے جو خود منشاء فطرت کے مطابق ہو۔

(۲)

خاندان کی تاسیس | اب یہ سوال خود بخود ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کا منشا کیا ہے؟ کیا اس معاملہ میں ہمکو بالکل تاریکی میں چھوڑ دیا گیا ہے کہ آنکھیں بند کر کے ہم جس چیز پر چاہیں ہاتھ رکھدیں اور وہی فطرت کا منشاء قرار پا جائے؟ یا نوامیس فطرت پر غور کرنے سے ہم منشاء فطرت تک پہنچ سکتے ہیں؟ شائد بہت سے لوگ صورتِ اول ہی کے قائل ہیں، اور اسی لیے وہ نوامیس فطرت پر نظر کیے بغیر ہی کیف ما اتفق جس چیز کو چاہتے ہیں منشاء فطرت کہدیتے ہیں۔ لیکن ایک محقق جب حقیقت کی جستجو کے لیے نکلتا ہے تو چند ہی قدم چل کر اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا

فطرت آپ ہی اپنے منشا کیطرف صاف انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہی ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ تمام انواع حیوانی کیطرح انسان کو بھی زوجین یعنی دو صنفوں کی صورت میں پیدا کرنے اور انکے درمیان صنفی کشش کی تخلیق کرنے سے فطرت کا اولین مقصد بقائے نوع ہے۔ لیکن انسان سے فطرت کا مطالبہ صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ وہ اس سے بڑھکر کچھ دوسرے مطالبات بھی اس سے کرتی ہے اور بادنیٰ تامل ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ مطالبات کیا ہیں اور کس نوعیت کے ہیں۔

سب سے پہلے جس چیز پر ہماری نظر پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام حیوانات کے برعکس انسان کا بچہ نگہداشت اور پرورش کے لیے بہت زیادہ وقت، محنت اور توجہ مانگتا ہے اگر اسکو مجرد ایک حیوانی وجود ہی کی حیثیت سے لیا جائے، تب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے ــــ یعنی غذا حاصل کرنے اور اپنے نفس کی مدافعت کرنے ــــ کے قابل ہوتے ہوتے وہ کئی سال لے لیتا ہے، اور ابتدائی دو تین سال تک تو وہ اتنا بے بس ہوتا ہے کہ ماں کی پیہم توجہ کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ انسان خواہ وحشت کے کتنے ہی ابتدائی درجہ میں ہو، بہرحال نرا حیوان نہیں ہے کسی نہ کسی مرتبہ کی مدنیت بہرحال اسکی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ اور اس مدنیت کی وجہ سے پرورش اولاد کے فطری تقاضے پر لامحالہ دو اور تقاضوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ بچہ کی پرورش میں ان تمام تمدنی وسائل سے کام لیا جائے جو اسکے پرورش کرنے والے کو بہم پہنچ سکیں۔ دوسرے یہ کہ بچے کو ایسی تربیت دی جائے کہ جس تمدنی ماحول میں وہ پیدا ہوا ہے وہاں تمدن کے کارخانے کو چلانے اور سابق کارکنوں کی جگہ لینے کے لیے وہ تیار ہو سکے۔

پھر تمدن جتنا زیادہ ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجہ کا ہوتا جاتا ہے، یہ دونوں تقاضے بھی اتنے ہی زیادہ بھاری اور بوجھل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک طرف پرورش اولاد کے ضروری وسائل و لوازم بڑھتے جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف تمدن نہ صرف اپنے قیام و بقاء کے لیے اپنے مرتبے کے مطابق اچھے تعلیم و تربیت یافتہ کارکن مانگتا ہے، بلکہ اپنے نشوونما ارتقاء کے لیے یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ ہر نسل پہلی نسل سے بہتر اٹھے، یعنی دوسرے الفاظ میں ہر بچے کا نگہبان اس کو خود اپنے آپ سے بہتر بنانے کی کوشش کرے ــــ انتہا درجہ کا ایثار جو انسان سے جذبۂ خود پسندی تک کی قربانی مانگتا ہے!

یہ ہیں فطرت انسانی کے مطالبات، اور ان مطالبات کی اولین مخاطب عورت ہے۔ مرد ایک ساعت کے لیے عورت سے مل کر ہمیشہ کے لیے اُس سے اور اِس ملاقات کی ذمہ داری سے الگ ہو سکتا ہے۔ لیکن عورت کو تو اس ملاقات کا قدرتی نتیجہ برسوں کے لیے بلکہ عمر بھر کے لیے پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ حمل قرار پانے کے بعد کم از کم پانچ برس تک تو یہ نتیجہ اس کا پیچھا کسی طرح چھوڑتا ہی نہیں، اور اگر تمدن کے پورے مطالبات ادا کرنے ہوں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ مزید ۱۵ سال تک وہ عورت، جس نے ایک ساعت کے لیے مرد کی معیت کا لطف اٹھایا تھا، اسکی ذمہ داریوں کا بار سنبھالتی رہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مشترک فعل کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تنہا ایک فریق کس طرح آمادہ ہو سکتا ہے؟ جب تک عورت کو اپنے شریک کار کی بے وفائی کے خوف سے نجات نہ ملے، جب تک اسے اپنے بچے کی پرورش کا پورا اطمینان نصیب نہ ہو جائے، جب تک اسے خود اپنی ضروریات زندگی فراہم کرنے کے کام سے بھی ایک بڑی حد تک سبکدوش نہ کر دیا جائے، وہ اتنے بھاری کام کا بوجھ اٹھانے پر کیسے آمادہ ہو جائیگی؟ جس عورت کا کوئی قوام (Protector, provider) نہ ہو اس کے لیے تو حمل یقیناً ایک حادثہ، ایک مصیبت، بلکہ ایک خطرناک بلا ہے جس سے چھٹکارا پانے کی خواہش اُس میں طبیعی طور پر پیدا ہونی ہی چاہیے۔ آخر وہ اسے خوش آمدید کس طرح کہہ سکتی ہے؟

لامحالہ یہ ضروری ہے ——— اگر نوع کا بقاء اور تمدن کا قیام و ارتقاء ضروری ہے ——— کہ جو مرد جس عورت کو بارآور کرے وہی اِس بار کو سنبھالنے میں اسکا شریک بھی ہو۔ مگر اس شرکت پر اسے راضی کیسے کیا جائے؟ وہ تو فطرةً خودغرض واقع ہوا ہے۔ جہاں تک بقائے نوع کے طبیعی فریضہ کا تعلق ہے، اس کے حصہ کا کام تو اسی ساعت پورا ہو جاتا ہے جبکہ وہ عورت کو بارور کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ بار تنہا عورت کے ساتھ لگا رہتا ہے، اور مرد سے وہ کسی طرح بھی چسپان نہیں ہوتا۔ جہاں تک صنفی کشش کا تعلق ہے، وہ بھی اسے مجبور نہیں کرتی کہ اُسی عورت کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ چاہے تو اسے چھوڑ کر دوسری، اور دوسری کو چھوڑ کر تیسری سے تعلق پیدا کر سکتا ہے، اور ہر زمین میں بیج پھینکتا پھر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ معاملہ محض اسکی مرضی پر

بچھوڑ دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بخوشی اس بار کو سنبھالنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ آخر کون سی چیز اسے مجبور کرنے والی ہے کہ وہ اپنی محنتوں کا پھل اُس عورت اور اُس بچے پر صرف کرے؟ کیوں وہ ایک دوسری حسین دوشیزہ کو چھوڑ کر اس پیٹ پھولی عورت سے اپنا دل لگائے رکھے؟ کیوں وہ گوشت پوست کے ایک بیکار لوتھڑے کو خواہ مخواہ اپنے خرچ پر پالے؟ کیوں اسکی چیخوں سے اپنی نیند حرام کرے؟ کیوں اُس چھوٹے سے شیطان کے ہاتھوں اپنا نقصان کرائے جو ہر چیز کو توڑتا پھوڑتا اور گھر بھر میں گندگی پھیلاتا پھرتا ہے اور کسی کی سن کر نہیں دیتا؟

فطرت نے کسی حد تک اس مسئلے کے حل کا خود بھی اہتمام کیا ہے۔ اس نے عورت میں حُسن، شیرینی، دل لبھانے کی طاقت، اور محبت کے لیے ایثار و قربانی کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے تاکہ ان ہتھیاروں سے مرد کی خود غرضانہ انفرادیت پر فتح پائے اور اسے اپنا اسیر بنالے۔ اس نے بچے کے اندر بھی ایک عجیب قوتِ تسخیر بھر دی ہے تاکہ وہ اپنی تکلیف دہ، بربادکن، ناجیانہ خصوصیات کے باوجود ماں باپ کو اپنے دامِ محبت میں گرفتار رکھے مگر صرف یہی چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ بجائے خود ان کا زور انسان کو اپنے اخلاقی، فطری، تمدنی فرائض ادا کرنے کے لیے برسوں نقصان، اذیت، قربانی برداشت کرنے پر مجبور کر سکے۔ آخر انسان کے ساتھ اسکا وہ ازلی دشمن، شیطان بھی تو لگا ہوا ہے جو اسے فطرت کے راستے سے منحرف کرنے کی ہر وقت کوشش کرتا رہتا ہے، جسکی زنبیل عیاری میں ہر زمانے اور ہر نسل کے لوگوں کو بہکانے کے لیے طرح طرح کی دلیلوں اور ترغیبات کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ بھرا ہوا ہے۔

یہ مذہب کا معجزہ ہے کہ وہ انسان کو — مرد اور عورت دونوں کو — نوع اور تمدن کے لیے قربانی پر آمادہ کرتا ہے، اور اس خود غرض جانور کو آدمی بنا کر ایثار کے لیے تیار کر دیتا ہے۔ وہ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء ہی تھے جنہوں نے فطرت کے منشار کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر عورت اور مرد کے درمیان صنفی تعلق اور تمدنی تعاون کی صحیح صورت، نکاح تجویز کی۔ انہی کی تعلیم و ہدایت سے دنیا کی ہر قوم اور ہر دور کے

زمین کے ہر گوشے میں نکاح کا طریقہ جاری ہوا۔ انہی کے پھیلائے ہوئے اخلاقی اصولوں سے انسان کے اندر اتنی روحانی صلاحیت پیدا ہوئی کہ وہ اس خدمت کی تکلیفوں اور نقصانات کو برداشت کرے، ورنہ حق یہ ہے کہ ماں اور باپ سے بڑھ کر بچوں کا دشمن کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ انہی کے قائم کیے ہوئے ضوابط معاشرت سے خاندانی نظام کی بنا پڑی جس کی مضبوط گرفت لڑکیوں اور لڑکوں کو اس ذمہ دارانہ تعلق اور اس اشتراک عمل پر مجبور کرتی ہے، ورنہ شباب کے حیوانی تقاضوں کا زور اتنا سخت ہوتا ہے کہ محض اخلاقی ذمہ داری کا احساس کسی خارجی ڈسپلن کے بغیر ان کو آزادشہوت رانی سے نہ روک سکتا تھا۔ شہوت کا جذبہ بجائے خود اجتماعیت کا دشمن (Anti-social) ہے۔ یہ خودغرضی، انفرادیت اور انارکی کا میلان رکھنے والا جذبہ ہے۔ اس میں پائیداری نہیں۔ اس میں احساس ذمہ داری نہیں۔ یہ محض وقتی لطف اندوزی کے لیے تحریک کرتا ہے۔ اس دیو کو مسخر کر کے اس سے اجتماعی زندگی کی ـــــ اُس زندگی کی جو صبر و ثبات، محبت اور قربانی، ذمہ داری اور پیہم جفاکشی چاہتی ہے ـــــ خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ نکاح کا قانون اور خاندان کا نظام ہی ہے جو اس دیو کو شیشے میں اتار کر اس سے شرارت اور بدنظمی کی ایجنسی چھین لیتا ہے اور اسے مرد و عورت کے اُس لگاتار تعاون و اشتراک عمل کا ایجنٹ بنا دیتا ہے جو اجتماعی زندگی کی تعمیر کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کی تمدنی زندگی ختم ہو جائے، انسان حیوانوں کی طرح رہنے لگیں، اور بالآخر نوع انسانی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے۔

پس صنفی میلان کو انارکی اور بے اعتدالی سے روک کر اُس کے فطری مطالبات کی تسکین و تشفی کے لیے جو راستہ خود فطرت چاہتی ہے کہ کھولا جائے وہ صرف یہی ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کی صورت میں مستقل وابستگی ہو، اور اس وابستگی سے خاندانی نظام کی بنا پڑے۔ تمدن کے وسیع کارخانے کو چلانے کے لیے جن پرزوں کی ضرورت ہے، وہ خاندان کی اسی چھوٹی کارگاہ میں تیار کیے جاتے ہیں۔ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے جوان ہوتے ہی کارگاہ کے منتظمین کو خود بخود یہ فکر لگ جاتی ہے کہ حتی الامکان اُن کے ایسے جوڑ لگائیں جو ایک دوسرے

کے لیے زیادہ سے زیادہ مناسب ہوں تاکہ انکے ملاپ سے زیادہ سے زیادہ بہتر نسل پیدا ہو سکے ۔ پھر ان سے جو نسل نکلتی ہے، اِس کارگاہ کا ہر کارکن اپنے دل کے سچے جذبہ سے کوشش کرتا ہے کہ اسکو جتنا بہتر بنا سکتا ہے بنائے زمین پر اپنی زندگی کا پہلا لمحہ شروع کرتے ہی بچہ کو خاندان کے دائرہ میں محبت، خبرگیری، حفاظت اور تربیت کا وہ ماحول ملتا ہے جو اس کے نشوونما کے لیے آبِ حیات کا حکم رکھتا ہے ۔ درحقیقت خاندان ہی میں بچے کو وہ لوگ مل سکتے ہیں جو اس سے نہ صرف محبت کرنے والے ہوں، بلکہ جو اپنے دل کی اُمنگ سے یہ چاہتے ہوں کہ بچہ جس مرتبے پر پیدا ہوا ہے اس سے اونچے مرتبے پر پہنچے ۔ دنیا میں صرف ماں اور باپ ہی کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو ہر لحاظ سے خود اپنے سے بہتر حالت میں اور اپنے سے بڑھا ہوا دیکھیں ۔ اس طرح وہ بلا ارادہ، غیر شعوری طور پر آئندہ نسل کو موجودہ نسل سے بہتر بنانے اور انسانی ترقی کا راستہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ انکی اس کوشش میں خود غرضی کا شائبہ تک نہیں ہوتا ۔ وہ اپنے لیے کچھ نہیں چاہتے ۔ وہ بس اپنے بچے کی فلاح چاہتے ہیں، اور اسکے ایک کامیاب اور عمدہ انسان بن کر اٹھنے ہی کو اپنی محنت کا کافی صلہ سمجھتے ہیں ۔ ایسے مخلص کارکن (labourer) اور ایسے بے غرض خادم (Workers) تم کو خاندان کی اس کارگاہ کے باہر کہاں ملینگے جو نوعِ انسانی کی بہتری کے لیے نہ صرف بلا معاوضہ محنت کریں، بلکہ اپنا وقت، اپنی آسائش، اپنی قوت و قابلیت، اور اپنی محنت کی کمائی سب کچھ اس خدمت میں صرف کر دیں ؟ جو اس چیز پر اپنی ہر قیمتی شئے قربان کرنے کے لیے تیار ہوں جس کا پھل دوسرے کھانے والے ہیں ؟ جو اپنی محنتوں کا صلہ بس اسکو سمجھیں کہ دوسروں کے لیے انہوں نے بہتر کارکن اور خادم فراہم کر دیے ؟ کیا اس سے زیادہ پاکیزہ اور بلند ترین ادارہ انسانیت میں کوئی دوسرا بھی ہے ؟

ہر سال نسل انسانی کو اپنے بقا کے لیے اور تمدن انسانی کو اپنے تسلسل و ارتقاء کے لیے ایسے لاکھوں کروڑوں جوڑوں کی ضرورت ہے جو بخوشی و رضا اپنے آپ کو اس خدمت اور اسکی ذمہ داریوں کے لیے پیش کریں، اور نکاح کر کے اس نوعیت کی مزید کارگاہوں کی بنا ڈالیں ۔ یہ عظیم الشان کارخانہ جو دنیا میں

چل رہا ہے، یہ اسی طرح چل اور بڑھ سکتا ہے کہ اس قسم کے رضاکار پیہم خدمت کے لیے اٹھتے رہیں اور اس کارخانہ کے لیے کام کے آدمی فراہم کیے جائیں - اگر نئی بھرتی نہ ہو، اور قدرتی اسباب سے پرانے کارکن بیکار ہو کر ہٹتے جائیں تو کام کے آدمی کم اور کم تر ہوتے چلے جائینگے اور ایک دن یہ ساز ہستی بالکل ہی بے نوا ہو کر رہ جائیگا۔ ہر آدمی جو اس تمدن کی مشین کو چلا رہا ہے، اس کا فرض صرف یہی نہیں ہے کہ اپنے جیتے جی اسکو چلائے جائے، بلکہ یہ بھی ہے کہ اپنی جگہ لینے کے لیے اپنے سے بہتر یا کم از کم اپنے ہی جیسے اشخاص مہیا کرنے کی کوشش کرے۔

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نکاح کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ صنفی جذبات کی تسکین و تشفی کے لیے ایک ہی جائز صورت ہے، بلکہ دراصل یہ ایک اجتماعی فریضہ ہے، یہ فرد پر جماعت کا فطری حق ہے، اور فرد کو اس بات کا اختیار ہرگز نہیں دیا جاسکتا کہ وہ نکاح کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ خود اپنے لیے محفوظ رکھے۔ جو لوگ بغیر کسی معقول وجہ کے نکاح سے انکار کرتے ہیں وہ جماعت کے نکھٹو افراد (Parasites) بلکہ غدار اور لٹیرے ہیں - ہر فرد جو زمین پر پیدا ہوا ہے، اس نے زندگی کا پہلا سانس لینے کے بعد سے جوانی کی عمر کو پہنچنے تک اُس بے حد و حساب سرمایہ سے استفادہ کیا ہے جو پچھلی نسلوں نے فراہم کیا تھا۔ اُن کے قائم کیے ہوئے ادارات ہی کی بدولت اسکو زندہ رہنے، بڑھنے، پھلنے پھولنے، اور آدمیت میں نشو و نما پانے کا موقع ملا۔ اس دوران میں وہ لیتا ہی رہا - اس نے دیا کچھ نہیں - جماعت نے اس امید پر اسکی ناقص قوتوں کو تکمیل کی طرف لے جانے میں اپنا سرمایہ اور اپنی قوت صرف کی کہ جب وہ خود کچھ دینے کے قابل ہوگا تو دیگا۔ اب اگر وہ بڑا ہو کر اپنے لیے شخصی آزادی اور خود مختاری کا مطالبہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں صرف اپنی خواہشات پوری کرونگا مگر اُن ذمہ داریوں اور اُن فرائض کا بوجھ نہ اٹھاؤنگا جو ان خواہشات کے ساتھ وابستہ ہیں، تو دراصل وہ جماعت کے ساتھ غداری اور دھوکہ بازی کرتا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ ایک ظلم اور بے انصافی ہے۔ جماعت میں شعور موجود ہو تو وہ اس مجرم کو جنٹلمین، یا معزز لیڈی، یا مقدس بزرگ سمجھنے کے بجائے اُس نظر سے دیکھے جس سے وہ

چوروں، ڈاکوؤں اور جعلسازوں کو دیکھتی ہے۔ ہم نے خواہ چاہا ہو یا نہ چاہا ہو، بہر طور ہم اُس تمام سرمایہ اور ذخیرہ کے وارث ہوئے ہیں جو ہم سے پہلے کی نسلوں نے چھوڑا ہے۔ اب ہم اس فیصلہ میں آزاد کیسے ہو سکتے ہیں کہ جس فطری قانون کے مطابق یہ ورثہ ہم تک پہنچا ہے اس کے منشا کو پورا کریں یا نہ کریں؟ ایسی نسل تیار کریں یا نہ کریں جو نوع انسانی کے اس سرمایہ اور ذخیرہ کی وارث ہو؟ اسکو سنبھالنے کے لیے دوسرے آدمی اسی طرح تیار کریں یا نہ کریں جس طرح ہم خود تیار کیے گئے ہیں؟

(۳)

صنفی آوارگی کا سدباب نکاح اور تاسیس خاندان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حصنِ نکاح سے باہر خواہشات صنفی کی تسکین کا دروازہ سختی کے ساتھ بند کیا جائے کیونکہ اس کے بغیر فطرت کا وہ منشا پورا نہیں ہو سکتا جس کے لیے وہ نکاح اور تاسیس خاندان کا تقاضا کرتی ہے۔

پرانی جاہلیت کی طرح اس نئی جاہلیت کے دور میں بھی اکثر لوگ زنا کو ایک فطری فعل سمجھتے ہیں اور نکاح انکے نزدیک محض تمدن کی ایجاد کردہ مصنوعات یا زوائد میں سے ایک چیز ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ فطرت نے جس طرح ہر بکری کو ہر بکرے کے لیے، اور ہر کتیا کو ہر کتے کے لیے پیدا کیا ہے اسی طرح ہر عورت کو بھی ہر مرد کے لیے پیدا کیا ہے، اور فطری طریقہ یہی ہے کہ جب خواہش ہو، جب موقع بہم پہنچ جائے، اور جب دونوں صنفوں کے کوئی سے دو فرد باہم راضی ہوں، تو انکے درمیان اُسی طرح صنفی عمل واقع ہو جائے جس طرح جانوروں میں ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فطرت انسانی کی بالکل غلط تعبیر ہے۔ ان لوگوں نے انسان کو محض ایک حیوان سمجھ لیا ہے، لہٰذا جب کبھی یہ فطرت کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے انکی مراد حیوانی فطرت ہوتی ہے نہ کہ انسانی فطرت۔ جس منتشر صنفی تعلق کو یہ فطری کہتے ہیں وہ حیوانات کے لیے تو ضرور فطری ہے مگر انسان کے لیے ہرگز فطری نہیں۔ وہ نہ صرف انسانی فطرت کے خلاف ہے، بلکہ اپنے آخری نتائج کے اعتبار سے اُس حیوانی فطرت کے بھی خلاف واقع ہو جاتا ہے جو انسان کے اندر موجود ہے، اسلیے کہ انسان کے

اندر انسانیت اور حیوانیت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ دراصل ایک وجود کے اندر دونوں مل کر ایک ہی شخصیت بناتی ہیں اور دونوں کے مقتضیات باہم ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جاتے ہیں کہ جہاں ایک کے منشار سے منہ موڑ اگیا، دوسری کا منشار بھی خود بخود فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

زنا میں بظاہر آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کم از کم فطرت حیوانی کے اقتضار کو تو پورا کر دیتی ہے، کیونکہ تناسُل اور بقائے نوع کا مقصد مجرد صنفی عمل سے پورا ہو جاتا ہے عام اس سے کہ وہ نکاح کے اندر ہو یا باہر۔ لیکن اس سے پہلے جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں اس پر پھر ایک نگاہ ڈال کر دیکھ لیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ فعل جس طرح فطرت انسانی کے مقصد کو نقصان پہنچاتا ہے اسی طرح فطرت حیوانی کے مقصد کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ فطرت انسانی چاہتی ہے کہ صنفی تعلق میں استحکام اور استقلال ہو تاکہ بچہ کو ماں اور باپ مل کر پرورش کریں اور ایک کافی مدت تک مرد نہ صرف بچہ کا بلکہ بچہ کی ماں کا بھی کفیل رہے۔ اگر مرد کو یقین نہ ہو کہ بچہ اسی کا ہے تو وہ اسکی پرورش کے لیے قربانی اور تکلیفیں برداشت ہی نہ کریگا اور نہ یہی گوارا کریگا کہ وہ اسکے بعد اسکے ترکہ کا وارث ہو۔ اسی طرح اگر عورت کو یقین نہ ہو کہ جو مرد اسے بارور کر رہا ہے وہ اسکی اور اسکے بچہ کی کفالت کے لیے تیار ہے تو وہ حمل کی مصیبت اٹھانے کے لیے تیار ہی نہ ہوگی۔ اگر بچہ کی پرورش میں ماں اور باپ تعاون نہ کریں تو اسکی تعلیم و تربیت اور اسکی اخلاقی، ذہنی اور معاشی حیثیت کبھی اُس معیار پر نہ پہنچ سکیگی جس سے وہ انسانی تمدن کے لیے کوئی مفید کارکن بن سکے۔ یہ سب فطرت انسانی کے مقتضیات ہیں اور جب ان مقتضیات سے منہ موڑ کر محض حیوانوں کی طرح مرد اور عورت عارضی تعلق قائم کرتے ہیں تو وہ خود فطرت حیوانی کے اقتضار (یعنی توالد و تناسل) سے بھی منہ موڑ جاتے ہیں، کیونکہ اس وقت توالد و تناسل انکے پیش نظر نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا۔ اس وقت انکے درمیان صنفی تعلق صرف خواہشات نفس کی تسکین اور صرف لذت طلبی و لطف اندوزی کے لیے ہوتا ہے جو سرے سے منشار فطرت ہی کے خلاف ہے۔

جاہلیت جدیدہ کے علمبردار اس پہلو کو خود بھی کمزور پاتے ہیں۔ اسلیے وہ اس پر ایک اور استدلال کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر جماعت کے دو فرد آپس میں مل کر چند ساعتیں لطف اور تفریح میں گزار دیں تو اس میں آخر سوسائٹی کا بگڑتا کیا ہے کہ وہ اس میں مداخلت کرے؟ سوسائٹی اُس صورت میں تو ضرور مداخلت کا حق رکھتی ہے جبکہ ایک فریق دوسرے پر جبر کرے، یا دھوکے اور فریب سے کام لے، یا کسی جماعتی قضیہ کا سبب بنے۔ لیکن جہاں ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہو، اور صرف دو اشخاص کے درمیان لذت اندوزی ہی کا معاملہ ہو تو سوسائٹی کو انکے بیچ میں حائل ہونے کا کیا حق ہے؟ لوگوں کے ایسے پرائیویٹ معاملات میں بھی اگر دخل دیا جائے تو شخصی آزادی محض ایک لفظ بے معنی ہو کر رہ جائیگی۔

شخصی آزادی کا یہ تصور اٹھارویں اور انیسویں صدی کی اُن جہالتوں میں سے ایک ہے جنکی تاریکی علم اور تحقیق کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی کافور ہو جاتی ہے۔ تھوڑے سے غور وخوض کے بعد ہی آدمی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ جس آزادی کا مطالبہ افراد کے لیے کیا جا رہا ہے اُسکے لیے کوئی گنجائش جماعتی زندگی میں نہیں ہے۔ جس کو ایسی آزادی مطلوب ہو اسے جنگل میں جا کر حیوانوں کی طرح رہنا چاہیے۔ انسانی اجتماع تو دراصل علائق اور روابط کے ایک ایسے جال کا نام ہے جس میں ہر فرد کی زندگی دوسرے بے شمار افراد کے ساتھ وابستہ ہے، ان پر اثر ڈالتی ہے اور ان سے اثر قبول کرتی ہے۔ اس تعلق باہمی میں انسان کے کسی فعل کو بھی خالص شخصی اور بالکل انفرادی نہیں کہا جا سکتا۔ کسی ایسے شخصی فعل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جس کا اثر بحیثیت مجموعی پوری جماعت پر نہ پڑتا ہو۔ افعالِ جوارح تو درکنار، دل میں چھپا ہوا کوئی خیال بھی ایسا نہیں جو ہمارے وجود پر اور اس سے منعکس ہو کر دوسروں پر اثر انداز نہ ہو۔ ہمارے قلب وجسم کی ایک ایک حرکت کے نتائج ہم سے منتقل ہو کر اتنی دور تک پہنچتے ہیں کہ ہمارا علم کسی طرح ان کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کا اپنی کسی قوت کو استعمال کرنا اسکی اپنی ذات کے سوا کسی پر اثر نہیں ڈالتا لہٰذا کسی کو اس سے کوئی سروکار نہیں، اور اسے اپنے معاملہ میں پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ اگر مجھے یہ آزادی نہیں دی جا سکتی کہ ہاتھ میں لکڑی لے کر جہاں

چاہوں گھماؤں، اپنے پاؤں کو حرکت دیکر جہاں چاہوں گھس جاؤں، اپنی گاڑی کو جس طرح چاہوں چلاؤں، اپنے گھر میں جتنی غلاظت چاہوں جمع کروں، اگر یہ اور ایسے ہی بے شمار شخصی معاملات اجتماعی ضوابط کے پابند ہونے ضروری ہیں تو آخر میری قوت شہوانی ہی تنہا اس شرف کی حقدار کیوں ہو کہ اسے کسی اجتماعی ضابطہ کا پابند نہ بنایا جائے اور مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے کہ اسے جس طرح چاہوں صرف کروں؟

یہ کہنا کہ ایک مرد اور ایک عورت باہم مل کر ایک پوشیدہ مقام پر سب سے الگ جو لطف اٹھاتے ہیں اسکا کوئی اثر جماعتی زندگی پر نہیں پڑتا، محض بچوں کی سی بات ہے۔ دراصل اسکا اثر صرف اس سوسائٹی پر ہی نہیں پڑتا جس سے وہ براہِ راست متعلق ہیں، بلکہ پوری انسانیت پر پڑتا ہے، اور اس کے اثرات صرف حال کے لوگوں ہی تک محدود نہیں رہتے بلکہ آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتے ہیں۔ جس اجتماعی و عمرانی رابطہ میں پوری انسانیت بندھی ہوئی ہے اس سے کوئی فرد کسی حال میں کسی محفوظ سے محفوظ مقام پر بھی الگ نہیں ہے۔ بند کمروں میں، دیواروں کی حفاظت میں بھی وہ اسی طرح جماعت کی زندگی سے مربوط ہے جس طرح بازار یا محفل میں ہے۔ جس وقت وہ خلوت میں اپنی تولیدی طاقت کو ایک عارضی اور غیر نتیجہ خیز لطف اندوزی پر ضائع کر رہا ہوتا ہے اس وقت دراصل وہ اجتماعی زندگی میں بدنظمی پھیلانے اور نوع کی حق تلفی کرنے اور جماعت کو بے شمار اخلاقی، مادّی، تمدنی نقصانات پہنچانے میں مشغول ہوتا ہے۔ وہ اپنی خود غرضی سے تمام اُن اجتماعی ادارات پر ضرب لگاتا ہے جن سے اس نے جماعت کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے فائدہ تو اٹھایا، مگر انکے قیام و بقاء میں اپنا حصہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ جماعت نے میونسپلٹی سے لیکر اسٹیٹ تک، مدرسے سے لیکر فوج تک، کارخانوں سے لیکر علمی تحقیقات کی مجلسوں تک جتنے بھی ادارے قائم کر رکھے ہیں، سب اسی اعتماد پر قائم کیے ہیں کہ ہر وہ فرد جو ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے، ان کے قیام اور انکی ترقی میں اپنا واجبی حصہ ادا کریگا۔ لیکن جب اس بے ایمان نے اپنی قوت شہوانی کو اس طرح استعمال کیا کہ اس میں توالد و تناسل اور تربیت اطفال کے فرائض انجام دینے کی سرے سے نیت ہی نہ تھی تو اس نے ایک ہی ضرب میں اپنی حد تک اس پورے

نظام کی جڑ کاٹ دی، اس نے اس اجتماعی معاہدہ کو توڑ ڈالا جس میں وہ عین اپنے انسان ہونے ہی کی حیثیت سے شریک تھا، اس نے اپنے ذمہ کا بار خود اٹھانے کے بجائے دوسروں پر سارا بار ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے بلکہ ایک چور، خائن اور لٹیرا ہے۔ اس کے ساتھ رعایت کرنا پوری انسانیت پر ظلم کرنا ہے۔

اجتماعی زندگی میں فرد کا مقام کیا ہے، اس چیز کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہ سکتا کہ ایک ایک قوت جو ہمارے نفس اور جسم میں ودیعت کی گئی ہے وہ محض ہماری ذات کے لیے نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہمارے پاس امانت ہے، اور ہم ان میں سے ہر ایک کے لیے پوری انسانیت کے حق میں جواب دہ ہیں۔ اگر ہم خود اپنی جان کو، یا اپنی ان قوتوں میں سے کسی قوت کو ضائع کرتے ہیں، یا اپنی غلط کاری سے خود اپنے آپ کو نقصان پہنچاتے ہیں، تو ہمارے اس فعل کی اصلی حیثیت یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہمارا تھا اسکو ہم نے ضائع کیا یا نقصان پہنچا دیا، بلکہ دراصل اسکی حیثیت یہ ہے کہ تمام عالم انسانی کے لیے جو امانت ہمارے پاس تھی اس میں ہم نے خیانت کی اور اپنی اس حرکت سے پوری نوع کو نقصان پہنچایا۔ ہمارا دنیا میں موجود ہونا خود اس بات پر شاہد ہے کہ دوسروں نے ذمہ داریوں اور تکلیفوں کا بوجھ اٹھا کر زندگی کا نور ہماری طرف منتقل کیا تب ہی ہم اس عالم میں آئے۔ پھر اسٹیٹ کی تنظیم نے ہماری جان کی حفاظت کی۔ حفظان صحت کے محکمے ہماری زندگی کے تحفظ میں لگے رہے۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں نے مل کر ہماری ضروریات فراہم کیں۔ تمام اجتماعی اداروں نے مل کر ہماری قوتوں کو سنوارنے اور تربیت دینے کی کوشش کی، اور تب ہیں وہ کچھ بنایا جو ہم ہیں۔ کیا ان سب کا یہ جائز بدلہ ہوگا، کیا یہ انصاف ہوگا کہ جس جان اور جن قوتوں کے وجود، بقا، نشو ونما میں دوسروں کا اتنا حصہ ہے اسکو ہم ضائع کر دیں یا مفید بنانے کے بجائے مضر بنائیں؟ خودکشی اسی بنا پر حرام ہے۔ ہاتھ سے شہوت رانی کرنے والے کو اسی وجہ سے دنیا کے سب سے بڑے حکیم نے ملعون کہا ہے (ناکح الید ملعون)۔ عمل قوم لوط کو اسی بنیاد پر بدترین جرم قرار دیا گیا ہے اور زنا بھی اسی وجہ سے انفرادی تفریح اور خوش وقتی نہیں ہے بلکہ پوری انسانی جماعت پر ظلم ہے۔

غور کیجیے، فعل زنا کے ساتھ کتنے اجتماعی مظالم کا قریبی اور گہرا رشتہ ہے :

(۱) سب سے پہلے ایک زانی اپنے آپ کو امراض خبیثہ کے خطرے میں ڈالتا ہے، اور اس طرح نہ صرف اپنی جسمانی قوتوں کی اجتماعی افادیت میں نقص پیدا کرتا ہے بلکہ جماعت اور نسل کو بھی نقصان پہنچاتا ہے سوزاک کے متعلق ہر طبیب آپکو بتادیگا کہ مجرائے بول کا یہ قرحہ شاذ و نادر ہی کامل طور پر مندمل ہوتا ہے۔ ایک بڑے ڈاکٹر کا قول ہے کہ "ایک دفعہ سوزاک ہمیشہ کے لیے سوزاک"۔ اس سے جگر، مثانہ، انثیین وغیرہ اعضا بھی بسا اوقات آفت رسیدہ ہو جاتے ہیں۔ گٹھیا اور بعض دوسرے امراض کا بھی یہ سبب بن جاتا ہے۔ اس سے مستقل بانجھ پن پیدا ہو جانے کا بھی امکان ہے۔ اور یہ دوسروں کی طرف متعدی بھی ہوتا ہے۔ رہا آتشک تو یہ کس کو معلوم نہیں کہ اس سے پورا نظام جسمانی مسموم ہو جاتا ہے۔ سر سے پاؤں تک کوئی عضو، بلکہ جسم کا کوئی جزء ایسا نہیں جس میں اسکا زہر نفوذ نہ کر جاتا ہو۔ یہ نہ صرف خود مریض کی جسمانی قوتوں کو ضائع کرتا ہے بلکہ ایک شخص سے نہ معلوم کتنے اشخاص تک مختلف ذرائع سے پہنچ جاتا ہے۔ پھر اس کی بدولت مریض کی اولاد اور اولاد کی اولاد تک بے قصور سزا بھگتی ہے۔ بچوں کا اندھا، گونگا، بہرا، فاتر العقل پیدا ہونا لطف کی اُن چند گھڑیوں کا ایک معمولی ثمرہ ہے جنہیں ظالم باپ نے اپنی زندگی کی متاع عزیز سمجھا تھا۔

(۲) امراض خبیثہ میں تو ہر زانی کا مبتلا ہو جانا یقینی نہیں ہے، مگر اُن اخلاقی کمزوریوں سے کسی کا بچنا ممکن نہیں جو اس فعل کے ساتھ لازماً تعلق رکھتی ہیں۔ بے حیائی، فریب کاری، جھوٹ، بدنیتی، خود غرضی، خواہشات کی غلامی، ضبطِ نفس کی کمی، خیالات میں آوارگی، طبیعت میں ذواقی اور ہرجائی پن اور ناوفاداری، یہ سب زنا کے وہ اخلاقی اثرات ہیں جو خود زانی کے نفس پر مترتب ہوتے ہیں۔ جو شخص یہ خصوصیات اپنے اندر پرورش کرتا ہے اسکی کمزوریوں کا اثر محض صنفی معاملات ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسکی طرف سے ہی ہدیہ جماعت کو پہنچتا ہے۔ اگر جماعت میں کثرت سے لوگوں کے اندر یہ اوصاف نشو و نما پا گئے ہوں تو انکی بدولت آرٹ اور ادب، تفریحات اور کھیل، علوم اور فنون، صنعت اور حرفت، معاشرت اور معیشت، سیاست اور عدالت، فوجی

خدمات اور انتظام ملکی، غرض ہر چیز کم و بیش ماؤف ہو کر رہیگی۔ خصوصاً جمہوری نظام میں تو افراد کی ایک ایک اخلاقی خصوصیت کا پوری قوم کی زندگی پر منعکس ہونا یقینی ہے۔ جس قوم کے بیشتر افراد کے مزاج میں کوئی قرار و ثبات نہ ہو، اور جس قوم کے اکثر اجزا ترکیبی وفا، ایثار، اور خواہشات پر قابو رکھنے کی صفات سے عاری ہوں، اسکی سیاست میں استحکام آخر آئیگا کہاں سے؟

(۳) زنا کو جائز رکھنے کے ساتھ یہ بھی لازم ہو جاتا ہے کہ سوسائیٹی میں فاحشہ گری کا کاروبار جاری رہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ایک جوان مرد کو "تفریح" کا حق حاصل ہے، وہ گویا ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں ایک معتد بہ طبقہ ایسی عورتوں کا موجود رہنا چاہیے جو ہر حیثیت سے انتہائی پستی و ذلت کی حالت میں ہوں۔ آخر یہ عورتیں آئینگی کہاں سے؟ اسی سوسائیٹی ہی میں سے تو پیدا ہونگی۔ بہرحال کسی کی بیٹی اور بہن ہی تو ہونگی۔ وہ لاکھوں عورتیں جو ایک ایک گھر کی ملکہ، ایک ایک خاندان کی بانی، کئی کئی بچوں کی مربی بن سکتی تھیں، انہی کو لاکر تو بازار میں بٹھانا پڑیگا تاکہ میونسپلٹی کے پیشاب خانوں کی طرح وہ آوارہ مزاج مردوں کے لیے رفع حاجت کا محل بنیں۔ اُن سے عورت کی تمام شریفانہ خصوصیات چھینی جائینگی۔ انہیں ناز فروشی کی تربیت دی جائیگی۔ انہیں اس غرض کے لیے تیار کیا جائیگا کہ اپنی محبت، اپنے دل، اپنے جسم، اپنے حُسن، اور اپنی اداؤں کو ہر ساعت ایک نئے خریدار کے ہاتھ بیچیں، اور کوئی نتیجہ خیز و بارآور خدمت کرنے کے بجائے تمام عمر دوسروں کی نفس پرستی کے لیے کھلونا بنی رہیں۔

(۴) زنا کے جواز سے نکاح کے تمدنی ضابطہ کو لامحالہ نقصان پہنچتا ہے، بلکہ انجام کار نکاح ختم ہو کر صرف زنا ہی زنا رہ جاتی ہے۔ اول تو زنا کا میلان رکھنے والے مردوں اور عورتوں میں یہ صلاحیت ہی بہت کم باقی رہ جاتی ہے کہ صحیح ازدواجی زندگی بسر کر سکیں۔ کیونکہ جو بدنیتی، بدنظری، ذواقی اور آوارہ مزاجی اس طریق کار سے پیدا ہوتی ہے، اور ایسے لوگوں میں جذبات کی جو بے ثباتی اور خواہشات نفس پر قابو نہ رکھنے کی جو کمزوری پرورش پاتی ہے وہ اُن صفات کے لیے سمِ قاتل ہے جو ایک کامیاب ازدواجی تعلق کے لیے ضروری ہیں۔ وہ اگر ازدواج کے رشتہ میں بندھینگے بھی تو ان کے درمیان وہ حسن سلوک، وہ سنجوگ، وہ باہمی اعتماد، اور وہ مہر و وفا کا رابطہ

زمین کے ہر گوشے میں نکاح کا طریقہ جاری ہوا - انہی کے پھیلائے ہوئے اخلاقی اصولوں سے انسان کے اندر اتنی روحانی صلاحیت پیدا ہوئی کہ وہ اس خدمت کی تکلیفوں اور نقصانات کو برداشت کرے، ورنہ حق یہ ہے کہ ماں اور باپ سے بڑھ کر بچوں کا دشمن کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا - انہی کے قائم کیے ہوئے ضوابط معاشرت سے خاندانی نظام کی بنا پڑی جس کی مضبوط گرفت لڑکیوں اور لڑکوں کو اس ذمہ دارانہ تعلق اور اس اشتراک عمل پر مجبور کرتی ہے، ورنہ شباب کے حیوانی تقاضوں کا زور اتنا سخت ہوتا ہے کہ محض اخلاقی ذمہ داری کا احساس کسی خارجی ڈسپلن کے بغیر ان کو آزادشہوت رانی سے نہ روک سکتا تھا - شہوت کا جذبہ بجائے خود اجتماعیت کا دشمن (Anti-social) ہے یہ خود غرضی، انفرادیت اور انارکی کا میلان رکھنے والا جذبہ ہے - اس میں پائیداری نہیں - اس میں احساس ذمہ داری نہیں - یہ محض وقتی لطف اندوزی کے لیے تحریک کرتا ہے - اس دیو کو مسخر کر کے اس سے اجتماعی زندگی کی ـــــ اُس زندگی کی جو صبر و ثبات، محبت اور قربانی، ذمہ داری اور پیہم جفاکشی چاہتی ہے ـــــ خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں - وہ نکاح کا قانون اور خاندان کا نظام ہی ہے جو اس دیو کو شیشے میں اتار کر اس سے شرارت اور بدنظمی کی ایجنسی چھین لیتا ہے اور اسے مرد و عورت کے اُس لگاتار تعاون و اشتراک عمل کا ایجنٹ بنا دیتا ہے جو اجتماعی زندگی کی تعمیر کے لیے ناگزیر ہے - یہ نہ ہو تو انسان کی تمدنی زندگی ختم ہو جائے، انسان حیوانوں کی طرح رہنے لگیں، اور بالآخر نوع انسانی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے -

پس صنفی میلان کو انارکی اور بے اعتدالی سے روک کر اُس کے فطری مطالبات کی تسکین و تشفی کے لیے جو راستہ خود فطرت چاہتی ہے کہ کھولا جائے وہ صرف یہی ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کی صورت میں مستقل وابستگی ہو، اور اس وابستگی سے خاندانی نظام کی بنا پڑے - تمدن کے وسیع کارخانے کو چلانے کے لیے جن پرزوں کی ضرورت ہے، وہ خاندان کی اسی چھوٹی کارگاہ میں تیار کیے جاتے ہیں - یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے جوان ہوتے ہی کارگاہ کے منتظمین کو خود بخود یہ فکر لگ جاتی ہے کہ حتی الامکان اُن کے ایسے جوڑ لگائیں جو ایک دوسرے

ناقص، بے وسیلہ، بے یار و مددگار اور مظلوم ہوگا، اور تمدن کے لیے بھی کسی طرح اتنا مفید نہ بن سکیگا جتنا وہ حلالی ہونے کی صورت میں ہو سکتا تھا۔

آزاد شہوت رانی کے حامی کہتے ہیں کہ بچوں کی پرورش اور تعلیم کے لیے ایک قومی نظام ہونا چاہیے تاکہ بچوں کو انکے والدین اپنے آزادانہ تعلق سے جنم دیں اور قوم انکو پال پوس کر تمدن کی خدمت کے لیے تیار کرے۔ اس تجویز سے ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کی آزادی اور انکی انفرادیت محفوظ رہے اور انکی نفسانی خواہشات کو نکاح کی پابندیوں میں جکڑے بغیر تولید نسل و تربیت اطفال کا مدعا حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کو موجودہ نسل کی انفرادیت اتنی عزیز ہے وہ آئندہ نسل کے لیے قومی تعلیم یا سرکاری تربیت کا ایسا سسٹم تجویز کرتے ہیں جس میں انفرادیت کے نشوونما اور شخصیت کے ارتقار کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس قسم کے ایک سسٹم میں جہاں ہزاروں لاکھوں بچے بیک وقت ایک نقشہ، ایک ضابطہ اور ایک ہی ڈھنگ پر تیار کیے جائیں، بچوں کا انفرادی تشخص کبھی ابھر اور نکھر سکتا ہی نہیں۔ وہاں تو ان میں زیادہ سے زیادہ یکسانی اور مصنوعی ہمواری پیدا ہوگی۔ اس کارخانے سے بچے اُسی طرح ایک سی شخصیت لیکر نکلیں گے جس طرح کسی بڑی فیکٹری سے لوہے کے پُرزے یکساں ڈھلے ہوئے نکلتے ہیں۔ غور تو کرو انسان کے متعلق ان کم عقل لوگوں کا تصور کتنا پست اور کتنا گھٹیا ہے۔ یہ باٹا کے جوتوں کی طرح انسانوں کو تیار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ بچہ کی شخصیت کو تیار کرنا ایک لطیف ترین آرٹ ہے۔ یہ آرٹ ایک چھوٹے نگار خانے ہی میں انجام پا سکتا ہے جہاں ہر مصور کی توجہ ایک ایک تصویر پہ مرکوز ہو۔ ایک بڑی فیکٹری میں جہاں کرایہ کے مزدور ایک ہی طرز کی تصویریں لاکھوں کی تعداد میں تیار کرتے ہوں، یہ آرٹ غارت ہوگا نہ کہ ترقی کریگا۔

پھر قومی تعلیم و تربیت کے سسٹم میں آپ کو بہرحال ایسے کارکنوں کی ضرورت ہوگی جو سوسائٹی کی طرف سے بچوں کو پرورش کرنے کا کام سنبھالیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس خدمت کو انجام دینے کے لیے ایسے ہی کارکن موزوں ہو سکتے ہیں جو اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو رکھتے ہوں اور جن میں خود اخلاقی انضباط پایا جاتا

ہو، اور نہ وہ بچوں میں اخلاقی انضباط کیسے پیدا کر سکینگے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے آدمی آپ لائینگے کہاں سے؟ آپ تو قومی تعلیم و تربیت کا سسٹم قائم ہی اسلیے کر رہے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح جب آپنے سوسائیٹی میں سے اخلاقی انضباط، اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت کا بیج ہی مار دیا تو اندھوں کی بستی میں آنکھوں والے دستیاب کہاں ہونگے کہ وہ نئی نسلوں کو دیکھ کر چلنا سکھائیں؟

(۷) زنا کے ذریعہ سے ایک خود غرض انسان جس عورت کو بچہ کی ماں بنا دیتا ہے اسکی زندگی ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جاتی ہے، اور اس پر ذلت اور نفرتِ عامہ، اور مصائب کا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے کہ جیتے جی وہ اس کے بوجھ تلے سے نہیں نکل سکتی۔ نئے اخلاقی اصولوں نے اس مشکل کا حل یہ تجویز کیا ہے کہ ہر قسم کی مادری کو مساوی عزت دیدی جائے خواہ وہ قیدِ نکاح کے اندر ہو یا باہر۔ کہا جاتا ہے کہ مادریت بہرحال قابلِ احترام ہے۔ اور یہ کہ جس لڑکی نے اپنی سادگی سے یا بے احتیاطی سے ماں بننے کی ذمہ داری قبول کر لی اس پر یہ ظلم ہے کہ سوسائیٹی میں اسے مطعون کیا جائے۔ لیکن اول تو یہ حل ایسا ہے کہ اس میں فاحشہ عورتوں کے لیے چاہے کتنی ہی سہولت ہو، سوسائیٹی کے لیے بحیثیت مجموعی سراسر مصیبت ہی مصیبت ہے۔ سوسائیٹی فطرۃً حرامی بچے کی ماں کو جس نفرت اور ذلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے وہ ایک طرف افراد کو گناہ اور بدکاری سے روکنے کے لیے ایک بڑی رکاوٹ ہے، اور دوسری طرف وہ خود سوسائیٹی میں بھی اخلاقی حس کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ اگر حرامی بچے کی ماں اور حلالی بچے کی ماں کو مساوی سمجھا جانے لگے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جماعت سے خیر اور شر، بھلائی اور برائی، گناہ اور صواب کی تمیز ہی رخصت ہو جائے۔ پھر بالفرض اگر یہ ہو بھی جائے تو کیا اس سے فی الواقع وہ مشکلات حل ہو جائینگی جو حرامی بچے کی ماں کو پیش آتی ہیں۔ تم اپنے نظریہ میں حرام اور حلال دونوں قسم کی مادری کو مساوی قرار دے سکتے ہو، مگر فطرت ان دونوں کو مساوی نہیں کرتی، اور حقیقت میں وہ کبھی مساوی ہو ہی نہیں سکتیں۔ انکی مساوات عقل، منطق، انصاف، حقیقت، ہر چیز کے خلاف ہے۔ آخر وہ بیوقوف عورت جس نے شہوانی جذبات کے وقتی ہیجان سے مغلوب ہو کر اپنے آپکو ایک ایسے خود غرض آدمی

کے حوالہ کر دیا جو اسکی اور اسکے بچہ کی کفالت کا ذمہ لینے کے لیے تیار نہ تھا، اُس عقلمند عورت کے برابر کس طرح ہوسکتی ہے جس نے اپنے جذبات کو اس وقت تک قابو میں رکھا جب تک اسے ایک شریف ذمہ دار آدمی نہ مل گیا؟ کونسی عقل ان دونوں کو یکساں کہہ سکتی ہے؟ تم چاہو تو نمائشی طور پر انہیں برابر کردو مگر تم اس بیوقوف عورت کو وہ کفالت و حفاظت، وہ ہمدردانہ رفاقت، وہ محبت آمیز نگہداشت، وہ خیر خواہانہ دیکھ بھال، اور وہ سکینت و طمانینت کہاں سے دلوا دوگے جو صرف ایک شوہر والی عورت ہی کو مل سکتی ہے؟ تم اسکے بچے کو باپ کی شفقت اور پورے سلسلۂ پدری کی محبت و عنایت کس بازار سے لادوگے؟ زیادہ سے زیادہ تم قانون کے زور سے اسکو نفقہ دلوا سکتے ہو۔ مگر کیا ایک ماں اور ایک بچہ کو دنیا میں صرف نفقہ ہی کی ضرورت ہوا کرتی ہے؟ پس یہ حقیقت ہے کہ حرام اور حلال کی مادریت کو یکساں کر دینے سے گناہ کرنے والیوں کو خارجی تسلی چاہے کتنی ہی مل جائے، بہرحال یہ چیز انکو انکی حماقت کے طبعی نتائج سے اور انکے بچوں کو اس طرح کی پیدائش کے حقیقی نقصانات سے نہیں بچا سکتی۔

ان وجوہ سے یہ بات جماعتی زندگی کے قیام اور صحیح نشوونما کے لیے اہم ترین ضروریات میں سے ہے کہ جماعت میں صنفی عمل کے انتشار کو قطعی روک دیا جائے، اور جذبات شہوانی کی تسکین کے لیے صرف ایک ہی دروازہ — ازدواج کا دروازہ — کھولا جائے۔ افراد کو زنا کی آزادی دینا انکے ساتھ بے جا رعایت اور سوسائٹی پر ظلم، بلکہ سوسائٹی کا قتل ہے۔ جو سوسائٹی اس معاملہ کو حقیر سمجھتی ہے اور زنا کو محض افراد کی "خوش وقتی" (Having a good time) سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہتی ہے، اور "آزادانہ تخم ریزی" (Sowing Wild Oats) کیساتھ رواداری برتنے کے لیے تیار ہے، وہ دراصل ایک جاہل سوسائٹی ہے۔ اسکو اپنے حقوق کا شعور نہیں ہے وہ آپ اپنے ساتھ دشمنی کرتی ہے۔ اگر اسے اپنے حقوق کا شعور ہو اور وہ جانے اور سمجھے کہ صنفی تعلقات کے معاملہ میں انفرادی آزادی کے اثرات جماعتی مفاد پر کیا مترتب ہوتے ہیں، تو وہ اس فعل کو اسی نظر سے دیکھے جس سے چوری، ڈاکہ اور قتل کو دیکھتی ہے۔ بلکہ یہ چوری سے اشد ہے۔ چور، قاتل اور ڈاکو زیادہ سے زیادہ ایک فرد یا چند افراد کا نقصان کرتے ہیں۔ مگر زانی پوری سوسائٹی

پر اور اسکی آئندہ نسلوں پر ڈاکہ مارتا ہے۔ وہ بیک وقت لاکھوں کروڑوں انسانوں کی چوری کرتا ہے۔ اسکے جرم کے نتائج ان سب مجرموں سے زیادہ دور رس اور زیادہ وسیع ہیں۔ جب یہ تسلیم ہے کہ افراد کی خود غرضانہ دست درازیوں کے مقابلہ میں سوسائیٹی کی مدد پر قانون کی طاقت ہونی چاہیے، اور جب اسی بنیاد پر چوری، قتل، لوٹ مار، جعلسازی اور غصب حقوق کی دوسری صورتوں کو جرم قرار دیکر تعزیر کے زور سے انکا سدِ باب کیا جاتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ زنا کے معاملہ میں بھی قانون سوسائیٹی کا محافظ نہ ہو اور اسے تعزیری جرم قرار نہ دیا جائے۔

اصولی حیثیت سے بھی یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ نکاح اور سفاح دونوں بیک وقت ایک ہی نظام معاشرت کے جز نہیں ہوسکتے۔ اگر ایک شخص کے لیے ذمہ داریاں قبول کیے بغیر خواہشات نفس کی تسکین جائز رکھی جائے تو اسی کام کے لیے نکاح کا ضابطہ مقرر کرنا محض بے معنی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل میں بلا ٹکٹ سفر کرنے کو جائز بھی رکھا جائے اور پھر سفر کے لیے ٹکٹ کا قاعدہ بھی مقرر کیا جائے۔ کوئی صاحب عقل آدمی ان دونوں طریقوں کو بیک وقت اختیار نہیں کرسکتا۔ معقول صورت یہی ہے کہ یا تو ٹکٹ کا قاعدہ سرے سے اڑا دیا جائے، یا اگر یہ قاعدہ مقرر کرنا ہے تو بلا ٹکٹ سفر کرنے کو جرم قرار دیا جائے۔ اسی طرح نکاح اور سفاح کے معاملہ میں بھی دو عملی ایک قطعی غیر معقول چیز ہے۔ اگر تمدن کے لیے نکاح کا ضابطہ ضروری ہے، جیسا کہ پہلے بدلائل ثابت کیا جاچکا ہے، تو اسکے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سفاح کو جرم قرار دیا جائے[1]

---

[1] ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ نکاح سے پہلے ایک جوان آدمی کو خواہشات نفس کی تسکین کا تھوڑا بہت موقع ضرور حاصل ہونا چاہیے، کیونکہ جوانی میں جذبات کے جوش کو روکنا مشکل ہے اور اگر روکا جائے تو صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن اس نتیجہ کی بنا جن مقدمات پر قائم ہے وہ سب غلط ہیں۔ جذبات کا ایسا جوش جو روکا نہ جاسکے ایک غیر معمولی (Abnormal) حالت ہے، اور معمولی (Normal) انسانوں میں یہ حالت صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ایک غلط نظام تمدن انکو زبردستی مشتعل کرتا ہے۔ ہمارے سینما، ہمارا لٹریچر، ہماری تصویریں، ہماری موسیقی، اور اس مخلوط سوسائیٹی میں بنی ٹھنی عورتوں کا ہر جگہ مردوں سے متصادم ہونا، یہی وہ اسباب ہیں جو خواہ مخواہ معمولی انسانوں کو شہوانی اعتبار سے غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ ورنہ ایک پرسکون فضا میں عام مردوں اور عورتوں کو ایسا ہیجان کبھی

(بقیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

جاہلیت کی خصوصیات میں سے یہ بھی ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ جن چیزوں کے نتائج محدود ہوتے ہیں اور جلدی اور محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں انکا تو ادراک کرلیا جاتا ہے، مگر جنکے نتائج وسیع اور دوررس ہونے کی وجہ سے غیر محسوس رہتے ہیں اور دیر میں مترتب ہوا کرتے ہیں انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، بلکہ ناقابل اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ چوری قتل اور ڈکیتی جیسے معاملات کو اہم اور زنا کو غیر اہم سمجھنے کی وجہ یہی ہے۔ جو شخص اپنے گھر میں طاعون کے چوہے جمع کرتا ہے، یا متعدی امراض پھیلاتا ہے، جاہلیت کا تمدن اسکو تو معافی کے قابل نہیں سمجھتا، کیونکہ اسکا فعل صریح طور پر نقصان رساں نظر آتا ہے، مگر جو زناکار اپنی خود غرضی سے تمدن کی جڑ کاٹتا ہے اسکے نقصانات چونکہ محسوس ہونے کے بجائے معقول ہیں اسلیے وہ جاہلوں کو ہر رعایت کا مستحق نظر آتا ہے، بلکہ انکی سمجھ میں یہ آتا ہی نہیں کہ اسکے فعل میں جرم کی آخر کونسی بات ہے۔ اگر تمدن کی بنیاد جاہلیت کے بجائے عقل اور علم فطرت پر ہو تو یہ طرز عمل کبھی اختیار نہ کیا جائے۔

(۴)

انسداد فواحش کی تدابیر تمدن کے لیے جو فعل نقصان دہ ہو اسکو روکنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اسے بس قانوناً جرم قرار دے دیا جائے اور اسکے لیے ایک سزا مقرر کردی جائے، بلکہ اسکے ساتھ چار قسم کی تدبیریں اور بھی اختیار کرنی ضروری ہیں:

ایک یہ کہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے افراد کی ذہنیت درست کی جائے اور انکے نفس کی اس حد تک

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ لاحق نہیں ہوسکتا کہ ذہن اور اخلاق کی تربیت سے اس کو ضبط نہ کیا جاسکے۔ اور یہ خیال کہ جوانی کے زمانہ میں صنفی عمل نہ کرنے سے صحت کو نقصان پہنچتا ہے لہٰذا صحت برقرار رکھنے کے لیے زنا کرنی چاہیے ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دراصل صحت اور اخلاق دونوں کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ معاشرت کے اس غلط نظام اور خوشحال زندگی کے ان غلط معیاروں کو بدلا جائے جن کی وجہ سے نکاح مشکل اور سفاح آسان ہوکر رہ گیا ہے۔

اصلاح کر دی جائے کہ وہ خود اس فعل سے نفرت کرنے لگیں، اسے گناہ سمجھیں، اور اُن کا اپنا اخلاقی وجدان انہیں اسکے ارتکاب سے باز رکھے۔

دوسرے یہ کہ جماعتی اخلاق اور رائے عام کو اس گناہ یا جرم کے خلاف اس حد تک تیار کر دیا جائے کہ عام لوگ اسے عیب اور لائق شرم فعل سمجھنے لگیں اور اسکے مرتکب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں تاکہ جن افراد کی تربیت ناقص رہ گئی ہو، یا جن کا اخلاقی وجدان کمزور ہو انہیں رائے عام کی طاقت ارتکاب جرم سے باز رکھے۔

تیسرے یہ کہ نظام تمدن میں ایسے تمام اسباب کا سدِباب کر دیا جائے جو اُس جرم کی تحریک کرنے والے اور اسکی طرف ترغیب و تحریص دلانے والے ہوں۔ اور اِسکے ساتھ ہی اُن اسباب کو بھی حتی الامکان دور کیا جائے جو افراد کو اس فعل پر مجبور کرنے والے ہوں۔

چوتھے یہ کہ تمدنی زندگی میں ایسی رکاوٹیں اور مشکلات پیدا کر دی جائیں کہ اگر کوئی شخص اس جرم کا ارتکاب کرنا بھی چاہے تو آسانی سے نہ کر سکے۔

یہ چاروں تدبیریں ایسی ہیں جنکی صحت اور ضرورت پر عقل شہادت دیتی ہے، فطرت انکا مطالبہ کرتی ہے اور بالفعل ساری دنیا کا تعامل بھی یہی ہے کہ سوسائٹی کا قانون جن جن چیزوں کو جرم قرار دیتا ہے ان سب کو روکنے کے لیے تعزیر کے علاوہ یہ چاروں تدبیریں بھی کم و بیش ضرور استعمال کی جاتی ہیں۔ اب اگر یہ مسلّم ہے کہ صنفی تعلقات کا انتشار تمدن کے لیے مہلک ہے اور سوسائٹی کے خلاف ایک شدید جرم کی حیثیت رکھتا ہے، تو لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ اسے روکنے کے لیے تعزیر کے ساتھ ساتھ وہ سب اصلاحی اور انسدادی تدابیر استعمال کرنی ضروری ہیں جنکا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اسکے لیے افراد کی تربیت بھی ہونی چاہیے، رائے عام کو بھی اسکی مخالفت کے لیے تیار کرنا چاہیے، تمدن کے دائرے سے ان تمام چیزوں کو خارج بھی کرنا چاہیے جو افراد کے شہوانی جذبات کو مشتعل کرتی ہیں، نظام معاشرت سے ان رکاوٹوں کو دور بھی کرنا چاہیے جو نکاح کے راستہ میں مشکلات پیدا کرتی ہیں، اور مردوں اور عورتوں کے تعلقات پر ایسی پابندیاں بھی عائد کرنی چاہئیں کہ اگر وہ دائرۂ ازدواج کے باہر صنفی تعلق قائم کرنے

کی طرف مائل ہوں تو انکی راہ میں بہت سے مضبوط حجابات حائل ہو جائیں۔ زنا کو جرم اور گناہ تسلیم کر لینے کے بعد کوئی صاحبِ عقل آدمی اِن تدابیر کے خلاف ایک لفظ نہیں کہہ سکتا۔

بعض لوگ اُن تمام اخلاقی و اجتماعی اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں جنکی بنیاد پر زنا کو گناہ قرار دیا گیا ہے، مگر ان کا اصرار یہ ہے کہ اسکے خلاف تعزیری اور انسدادی تدابیر اختیار کرنے کے بجائے صرف اصلاحی تدبیروں پر اکتفا کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ تعلیم اور تربیت کے ذریعہ سے لوگوں میں اتنا باطنی احساس، انکے ضمیر کی آواز میں اتنی طاقت، اور ان کے اخلاقی وجدان میں اتنا زور پیدا کر دو کہ وہ خود اس گناہ سے رک جائیں۔ اصلاحِ نفس کے بجائے تعزیر اور انسدادی تدابیر اختیار کرنے کے معنی تو یہ ہیں کہ تم آدمیوں کے ساتھ بچوں کا سا سلوک کرتے ہو بلکہ آدمیت کی توہین کرتے ہو۔ ہم بھی انکے ارشاد کو اس حد تک تسلیم کرتے ہیں کہ اصلاحِ آدمیت کا اعلیٰ اور اشرف طریقہ وہی ہے جو وہ بیان فرماتے ہیں۔ تہذیب کی غایت الغایات اور حقیقت یہی ہے کہ افراد کے باطن میں ایسی قوت پیدا ہو جائے جس سے وہ خود بخود سوسائیٹی کے قوانین کا احترام کرنے لگیں اور خود ان کا اپنا ضمیر ان کو اخلاقی ضوابط کی خلاف ورزی سے روک دے۔ اسی غرض کے لیے افراد کی تعلیم و تربیت پر سارا زور صرف کیا جاتا ہے۔ مگر کیا فی الواقع تہذیب اپنی اس غایت کو پہنچ چکی ہے؟ کیا حقیقت میں تعلیم اور اخلاقی تربیت کے ذرائع سے افرادِ انسانی کو اتنا مہذب بنایا جا چکا ہے کہ انکے باطن پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہو اور جماعتی نظام کی حفاظت کے لیے خارج میں کسی انسدادی اور تعزیری تدبیر کی ضرورت باقی نہ رہی ہو؟ زمانۂ قدیم کا ذکر چھوڑیے کہ آپ کی زبان میں وہ "تاریک دور" تھا۔ یہ بیسویں صدی، یہ "قرنِ منوّر" آپکے سامنے موجود ہے۔ اس زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے مہذب ترین ممالک کو دیکھ لیجیے جن کا ہر باشندہ تعلیم یافتہ ہے، جنکو اپنے شہریوں کی اعلیٰ تربیت پر ناز ہے۔ کیا وہاں تعلیم اور اصلاحِ نفس نے جرائم اور قانون شکنی کو روک دیا ہے؟ کیا وہاں چوریاں نہیں ہوتیں؟ ڈاکے نہیں پڑتے؟ قتل نہیں ہوتے؟ جعل اور فریب اور ظلم اور فساد کے واقعات پیش نہیں آتے؟ کیا وہاں پولیس، عدالت، جیل، تمدنی احتساب، کسی چیز کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی؟ کیا وہاں افراد کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا اتنا احساس پیدا ہو چکا ہے کہ اب انکے ساتھ "بچوں کا سا سلوک" نہیں کیا جاتا؟ اگر واقعہ یہ نہیں ہے، اگر اس

روشن زمانہ میں بھی سوسائیٹی کے نظم و آئین کو محض افراد کے اخلاقی وجدان پر نہیں چھوڑا جاسکتا ہے، اگر اب بھی ہر جگہ "آدمیت کی یہ توہین" ہو رہی ہے کہ جرائم کے سد باب کے لیے تعزیری اور انسدادی دونوں قسم کی تدبیریں استعمال کی جاتی ہیں، تو آخر کیا وجہ ہے کہ صرف صنفی تعلقات ہی کے معاملہ میں آپ کو یہ توہین ناگوار ہے؟ صرف اسی ایک معاملہ میں کیوں ان بچوں سے بڑوں کا سا سلوک کیے جانے پر آپ کو اصرار اور اتنا اصرار ہے؟ ذرا ٹٹول کر دیکھیے، کہیں دل میں کوئی چور تو چھپا ہوا نہیں ہے!

کہا جاتا ہے کہ جن چیزوں کو تم شہوانی محرکات قرار دے کر تمدن کے دائرے سے خارج کرنا چاہتے ہو وہ تو سب آرٹ اور ذوقِ جمال کی جان ہیں، انہیں نکال دینے سے تو انسانی زندگی میں لطافت کا چشمہ ہی سوکھ کر رہ جائیگا، لہذا تمہیں تمدن کی حفاظت اور معاشرت کی اصلاح جو کچھ بھی کرنی ہے اس طرح کرو کہ فنون لطیفہ اور جمالیت کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ ہم بھی ان حضرات کے ساتھ اس حد تک متفق ہیں کہ آرٹ اور ذوقِ جمال فی الواقع قیمتی چیزیں ہیں جنکی حفاظت بلکہ ترقی ضرور ہونی چاہیے۔ مگر سوسائیٹی کی زندگی اور اجتماعی فلاح ان سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے اسکو کسی آرٹ اور کسی ذوق پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ آرٹ اور جمالیت کو اگر پھلنا پھولنا ہے تو اپنے لیے نشو و نما کا وہ راستہ ڈھونڈیں جس میں وہ اجتماعی زندگی اور فلاح کے ساتھ ہم آہنگ ہوسکیں۔ جو آرٹ اور ذوق جمال زندگی کے بجائے ہلاکت اور فلاح کے بجائے فساد کی طرف لے جانے والا ہو اسے جماعت کے دائرے میں ہرگز پھولنے پھلنے کا موقع نہیں دیا جاسکتا۔ یہ کوئی ہمارا انفرادی اور خانہ زاد نظریہ نہیں ہے بلکہ یہی عقل و فطرت کا مقتضا ہے، تمام دنیا اسکو اصولاً تسلیم کرتی ہے، اور اسی پر ہر جگہ عمل بھی ہو رہا ہے۔ جن چیزوں کو بھی دنیا میں جماعتی زندگی کے لیے مہلک اور موجب فساد سمجھا جاتا ہے انہیں کہیں آرٹ اور ذوقِ جمال کی خاطر گوارا نہیں کیا جاتا۔ مثلاً جو لٹریچر فتنہ و فساد اور قتل و غارت گری پر ابھارتا ہو اسے کہیں بھی محض اسکی ادبی خوبیوں کی خاطر جائز نہیں رکھا جاتا۔ جس ادب میں طاعون یا ہیضہ پھیلانے کی ترغیب دی جائے اسے کہیں برداشت نہیں کیا جاتا۔ جو سینما یا تھیئیٹر امن شکنی اور بغاوت پر اکساتا ہو اسکو دنیا کی کوئی حکومت منظر عام پر آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ جو تصویریں ظلم اور فسادات اور شرارت کے

جذبات کی مظہر ہوں یا جن میں اخلاق کے تسلیم شدہ اصول توڑے گئے ہوں وہ خواہ کتنے ہی کمالِ فن کی حامل ہوں کوئی قانون اور کسی سوسائٹی کا ضمیر انکو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جیب کترنے کا فن اگرچہ ایک لطیف ترین فن ہے، اور ہاتھ کی صفائی کا اس سے بہتر کمال شائد ہی کہیں پایا جاتا ہو، مگر کوئی اسکے پھلنے پھولنے کا روادار نہیں ہوتا۔ جعلی نوٹ اور چیک اور دستاویزیں تیار کرنے میں حیرت انگیز ذہانت اور مہارت صرف کیجاتی ہے مگر کوئی اس آرٹ کی ترقی کو جائز نہیں رکھتا۔ ٹھگی میں انسانی دماغ نے اپنی قوتِ ایجاد کے کیسے کیسے کمالات کا اظہار کیا ہے، مگر کوئی مہذب سوسائٹی ان کمالات کی قدر کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ پس یہ اصول بجائے خود مسلّم ہے کہ جماعت کی زندگی، اسکا امن، اسکی فلاح و بہبود، ہر فنِ لطیف اور ہر ذوقِ جمال و کمال سے زیادہ قیمتی ہے، اور کسی آرٹ پر اسے قربان نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اختلاف جس امر میں ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک چیز کو ہم جماعتی زندگی اور فلاح کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں اور دوسرے ایسا نہیں سمجھتے۔ اگر اس امر میں انکا نقطۂ نظر بھی وہی ہوجائے جو ہمارا ہے تو انہیں بھی آرٹ اور ذوقِ جمال پر وہی پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگے گی جنکی ضرورت ہم محسوس کرتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناجائز صنفی تعلقات کو روکنے کے لیے عورتوں اور مردوں کے درمیان حجابات حائل کرنا، اور معاشرت میں انکے آزادانہ اختلاط پر پابندیاں لگانا دراصل ان کے اخلاق اور انکی سیرت پر حملہ ہے۔ اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ گویا تمام افراد کو بدچلن فرض کر لیا گیا ہے، اور یہ کہ ایسی پابندیاں عائد کرنے والوں کو نہ اپنی عورتوں پر اعتماد ہے نہ مردوں پر۔ بات بڑی معقول ہے۔ مگر اسی طرزِ استدلال کو ذرا آگے بڑھائیے۔ ہر قفل جو کسی دروازے پر لگایا جاتا ہے، گویا اس امر کا اعلان ہے کہ اسکے مالک نے تمام دنیا کو چور فرض کیا ہے۔ ہر پولیس مین کا وجود اس بات پر شاہد ہے کہ حکومت اپنی تمام رعایا کو بدمعاش سمجھتی ہے۔ ہر لین دین میں جو دستاویز لکھوائی جاتی ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ ایک فریق نے دوسرے فریق کو خائن قرار دیا ہے۔ ہر وہ انسدادی تدبیر جو ارتکابِ جرائم کی روک تھام کے لیے اختیار کی جاتی ہے، اسکے عین وجود میں یہ مفہوم شامل ہے کہ اُن سب

لوگوں کو امکانی مجرم فرض کیا گیا ہے جن پر اس تدبیر کا اثر پڑتا ہو۔ اس طرزِ استدلال کے لحاظ سے تو آپ ہر آن چور، بدمعاش، خائن اور مشتبہ چال چلن کے آدمی قرار دیے جاتے ہیں مگر آپ کی عزت نفس کو ذرا سی ٹھیس بھی نہیں لگتی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صرف اسی ایک معاملہ میں آپکے احساسات اتنے نازک ہو گئے ہیں؟

اصل بات وہی ہے جسکی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ جن لوگوں کے ذہن میں پرانے اخلاقی تصورات کا بچا کھچا اثر ابھی باقی ہے وہ زنا اور صنفی انارکی کو برا تو سمجھتے ہیں، مگر ایسا زیادہ برا نہیں سمجھتے کہ اسکے قطعی انسداد کی ضرورت محسوس کریں۔ اسی وجہ سے اصلاح و انسداد کی تدابیر میں ہمارا اور انکا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ اگر فطرت کے حقائق ان پر پوری طرح منکشف ہو جائیں اور وہ اس معاملہ کی صحیح نوعیت سمجھ لیں تو انہیں ہمارے ساتھ اس امر میں اتفاق کرنا پڑیگا کہ انسان جب تک انسان ہے اور اسکے اندر جب تک حیوانیت کا عنصر موجود ہے اُس وقت تک کوئی ایسا تمدن، جو اشخاص کی خواہشات اور انکے لطف و لذت سے بڑھ کر جماعتی زندگی کی فلاح کو عزیز رکھتا ہو، ان تدابیر سے غافل نہیں ہو سکتا۔

(۵)

تعلق زوجین کی صحیح صورت خاندان کی تاسیس اور صنفی انتشار کا سدِ باب کرنیکے بعد ایک صالح تمدن کے لیے جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نظام معاشرت میں مرد اور عورت کے تعلق کی صحیح نوعیت متعین کی جائے۔ ان کے حقوق ٹھیک ٹھیک عدل کے ساتھ مقرر کیے جائیں۔ انکے درمیان ذمہ داریاں پوری مناسبت کے ساتھ تقسیم کی جائیں۔ اور خاندان میں انکے مراتب اور وظائف کا تقرر اس طور پر ہو کہ اعتدال اور توازن میں فرق نہ آنے پائے۔ تمدن کے جملہ مسائل میں یہ مسئلہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ مگر انسان کو اس گتھی کے سلجھانے میں اکثر ناکامی ہوئی ہے۔

بعض قومیں ایسی ہیں جن میں عورت کو مرد پر قوّام بنایا گیا ہے۔ مگر ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اس قسم کی قوموں میں سے کوئی تہذیب و تمدن کے کسی اعلیٰ مرتبہ پر پہنچی ہو۔ کم از کم تاریخی معلومات کے ریکارڈ میں تو کسی ایسی قوم کا نشان پایا نہیں جاتا جس نے عورت کو حاکم بنایا ہو اور پھر دنیا میں عزت اور طاقت حاصل کی ہو یا کوئی کارنمایاں انجام دیا ہو۔

بیشتر اقوام عالم نے مرد کو عورت پر قوّام بنایا ہے۔ مگر اس ترجیح نے اکثر ظلم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ عورت کو لونڈی بنا کر رکھا گیا۔ اسکی تذلیل و تحقیر کی گئی۔ اس کو کسی قسم کے معاشی اور تمدنی حقوق نہ دیے گئے۔ اسکو خاندان میں ایک ادنیٰ خدمتگار اور مرد کے لیے آلۂ شہوت رانی بنا کر رکھا گیا، اور خاندان سے باہر عورتوں کے ایک گروہ کو کسی حد تک علم اور تہذیب کے زیوروں سے آراستہ کیا بھی گیا تو صرف اس لیے کہ وہ مردوں کے صنفی مطالبات زیادہ دلاویز طریقے سے پورے کریں، انکے لیے اپنی موسیقی سے لذتِ گوش، اور اپنے رقص اور ناز و ادا سے لذتِ نظر، اور اپنے صنفی کمالات سے لذتِ جسم بن جائیں۔ یہ عورت کی توہین و تذلیل کا سب سے زیادہ شرمناک طریقہ تھا جو مرد کی نفس پرستی نے ایجاد کیا، اور جن قوموں نے یہ طریقہ اختیار کیا وہ خود بھی نقصان سے نہ بچ سکیں۔

جدید مغربی تمدن نے تیسرا طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی یہ کہ مردوں اور عورتوں میں مساوات ہو، دونوں کی ذمہ داریاں یکساں اور قریب قریب ایک ہی طرح کی ہوں، دونوں ایک ہی حلقۂ عمل میں مسابقت کریں، دونوں اپنی روزی آپ کمائیں اور اپنی ضروریات کے آپ کفیل ہوں۔ معاشرت کی تنظیم کا یہ قاعدہ ابھی تک پوری طرح تکمیل کو نہیں پہنچا ہے کیونکہ مرد کی فضیلت و برتری اب بھی نمایاں ہے، زندگی کے کسی شعبہ میں بھی عورت مرد کی ہم پلّہ نہیں ہے، اور اسکو وہ تمام حقوق حاصل نہیں ہوئے ہیں جو کامل مساوات کی صورت میں اسکو ملنے چاہییں۔ لیکن جس حد تک بھی مساوات قائم کی گئی ہے۔ اس نے ابھی سے نظامِ تمدن میں فساد برپا کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ہم تفصیل کے ساتھ اسکے نتائج بیان کر چکے ہیں، لہٰذا یہاں اس پر کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ تینوں قسم کے تمدن عدل اور توازن اور تناسب سے خالی ہیں کیونکہ انہوں نے فطرت کی رہنمائی کو سمجھنے اور ٹھیک ٹھیک اسکے مطابق طریقہ اختیار کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ اگر عقلِ سلیم سے کام لے کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فطرت خود ان مسائل کا صحیح حل بتا رہی ہے۔ بلکہ یہ بھی دراصل فطرت ہی کی زبردست طاقت ہے جسکے اثر سے عورت نہ تو اس حد تک گر سکی جس حد تک اسے گرانے کی کوشش کی گئی، اور نہ اس حد تک بڑھ سکی جس حد تک اس نے بڑھنا چاہا یا مرد نے اسے بڑھانے کی کوشش کی۔ افراط و تفریط کے دونوں پہلو انسان نے غلط اندیش عقل اور اپنی

بہکے ہوئے تخیلات کے اثر سے اختیار کئے ہیں، اگر فطرت عدل اور تناسب چاہتی ہے، اور خود اس کی صورت بتاتی ہے۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان ہونے میں مرد اور عورت دونوں مساوی ہیں۔ دونوں نوع انسانی کے دو مساوی حصے ہیں۔ تمدن کی تعمیر اور تہذیب کی تاسیس و تشکیل، اور انسانیت کی خدمت میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ دل، دماغ، عقل، جذبات، خواہشات اور بشری ضروریات دونوں رکھتے ہیں۔ تمدن کی صلاح و فلاح کے لیے دونوں کی تہذیبِ نفس، دماغی تربیت اور عقلی و فکری نشو و نما یکساں ضروری ہے تاکہ تمدن کی خدمت میں ہر ایک اپنا اپنا پورا حصہ ادا کر سکے۔ اس اعتبار سے مساوات کا دعویٰ بالکل صحیح ہے، اور مصالح تمدن کا فرض یہی ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اپنی فطری استعداد اور صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع دے، انکو علم اور اعلیٰ تربیت سے مزین کرے، انھیں بھی مردوں کی طرح تمدنی و معاشی حقوق عطا کرے، اور انہیں معاشرت میں عزت کا مقام بخشے تاکہ ان میں عزت نفس کا احساس پیدا ہو اور انکے اندر وہ بہترین بشری صفات پیدا ہو سکیں جو صرف عزتِ نفس ہی کے احساس سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ جن قوموں نے اس قسم کی مساوات سے انکار کیا ہے، جنہوں نے اپنی عورتوں کو جاہل، ناتربیت یافتہ، ذلیل اور حقوقِ مدنیت سے محروم رکھا ہے وہ خود پستی کے گڑھے میں گر گئی ہیں، کیونکہ انسانیت کے پورے نصف حصہ کو گرا دینے کے معنی خود انسانیت کو گرا دینے کے ہیں۔ ذلیل ماؤں کی گودیوں سے عزت والے، اور ناتربیت یافتہ ماؤں کی آغوش سے اعلیٰ تربیت والے، اور پست خیال ماؤں کے گہوارے سے اونچے خیال والے انسان نہیں نکل سکتے۔

لیکن مساوات کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا حلقۂ عمل ایک ہی ہو، دونوں ایک ہی سے کام کریں، دونوں پر زندگی کے تمام شعبوں کی ذمہ داریاں یکساں عائد کر دی جائیں، اور نظام تمدن میں دونوں کی حیثیتیں بالکل ایک سی ہوں۔ اسکی تائید میں سائنس کے مشاہدات اور تجربات سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ عورت اور مرد اپنی جسمانی استعداد و قوت کے لحاظ سے مساوی (equipotential) ہیں۔ مگر صرف یہ امر کہ ان

دونوں میں اس قسم کی مساوات پائی جاتی ہے، اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ فطرت کا مقصود بھی دونوں سے ایک ہی طرح کے کام لینا ہے۔ ایسی رائے قائم کرنا اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ دونوں کے نظام جسمانی بھی یکساں ہیں، دونوں پر فطرت نے ایک ہی جیسی خدمات کا بار بھی ڈالا ہے، اور دونوں کی نفسی کیفیات بھی ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ انسان نے ابتک جتنی سائنٹیفک تحقیقات کی ہے اس سے ان تینوں تنقیحات کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

علم الحیات (Biology) کی تحقیقات سے ثابت ہوچکا ہے کہ عورت اپنی شکل و صورت اور ظاہری اعضاء سے لیکر اپنے جسم کے ذرات اور نسیجی خلایا (Protein molecules of tissue cells) تک ہر چیز میں مرد سے مختلف ہے۔ جس وقت رحم میں بچے کے اندر صنفی تشکیل (Sex-formation) واقع ہوتی ہے اسی وقت سے دونوں صنفوں کی جسمانی ساخت بالکل ایک دوسرے سے مختلف صورت میں ترقی کرتی ہے۔ عورت کا پورا نظام جسمانی اس طور پر بنایا جاتا ہے کہ وہ بچہ جننے اور اسکی پرورش کرنے کیلیے مستعد ہو۔ ابتدائی جنینی تشکیل سے لیکر سن بلوغ کو پہنچنے تک اسکے جسم کا پورا نشوونما اسی استعداد کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے، اور یہی چیز اسکی آئندہ زندگی کا راستہ معین کرتی ہے۔

بالغ ہونے پر ایام ماہواری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جسکے اثر سے اسکے جسم کے تمام اعضاء کی فعلیت متاثر ہو جاتی ہے۔ اکابر فن حیاتیات و عضویات کے مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام ماہواری میں عورت کے اندر حسب ذیل تغیرات ہوتے ہیں۔

۱۔ جسم میں حرارت کو روکنے کی قوت کم ہو جاتی ہے اس لیے حرارت زیادہ مقدار میں خارج ہوتی ہے، اور درجۂ حرارت گر جاتا ہے۔

۲۔ نبض سست ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ خلایائے دم کی تعداد میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔

۳- درون افرازی غدد (endocrines) گلے کی گلٹیوں (tonsils,) اور غدد لمفاوی (Lymphatic glands,) میں تغیر واقع ہوتا ہے۔

۴- پروٹینی تحوّل (protein metabolism) میں کمی آجاتی ہے۔

۵- فاسفیٹس اور کلورائیڈس کے اخراج میں کمی اور ہوائی تحول Gaseous metabolism میں انحطاط رونما ہوتا ہے۔

۶- ہضم میں اختلال واقع ہوتا ہے اور غذا کے پروٹینی اجزاء اور چربی کے جزو بدن بننے میں کمی ہوجاتی ہے۔

۷- تنفس کی قابلیت میں کمی اور گویائی کے اعضاء میں خاص تغیرات واقع ہوتے ہیں۔

۸- عضلات میں سستی اور احساسات میں بلادت آجاتی ہے۔

۹- ذہانت، اور خیالات کو مرکوز کرنیکی طاقت کم ہوجاتی ہے۔

یہ تغیرات ایک تندرست عورت کو بیماری کی حالت سے اس قدر قریب کردیتے ہیں کہ درحقیقت اس وقت صحت اور مرض کے درمیان کوئی واضح خط کھینچنا مشکل ہوتا ہے۔ سَو میں سے بمشکل ۲۳ عورتیں ایسی ہوتی ہیں جنکو ایام ماہواری بغیر کسی درد اور تکلیف کے آتے ہوں۔ ایک مرتبہ ۱۰۲۰ عورتوں کو بلا انتخاب لے کر انکے حالات کی تحقیق کی گئی تو ان میں سے ۸۴ فیصدی ایسی نکلیں جنکو ایام ماہواری میں درد اور دوسری قسم کی تکلیفوں سے سابقہ پیش آتا تھا۔ ڈاکٹر امیل نُووک جو اس شعبۂ علم کا بڑا محقق ہے، لکھتا ہے کہ:-

"حائضہ عورت میں عموماً جو کیفیات پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں: دردِ سر، تکان، اعضاشکنی، اعصابی کمزوری، طبیعت کی پستی، مثانہ کی بے چینی، ہضم کی خرابی، بعض حالات میں قبض، کبھی کبھی متلی اور قے۔ اچھی خاصی تعداد ایسی عورتوں کی ہے جن کی چھاتیوں میں ہلکا سا درد ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ اتنا شدید ہوجاتا ہے کہ ٹیسیں سی اٹھتی معلوم ہوتی ہیں۔ بعض عورتوں کا غدۂ درقیہ (تھائی رائڈ) اس زمانہ

میں سوج جاتا ہے جس سے گلا بھاری ہوجاتا ہے۔ بسا اوقات فتور ہضم کی شکایت ہوتی ہے، اور اکثر سانس لینے میں دقت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کریگر نے جتنی عورتوں کا معائنہ کیا ان میں سے آدھی ایسی تھیں جنکو ایام ماہواری میں بدہضمی کی شکایت ہوتی تھی اور آخری دنوں میں قبض ہوجاتا تھا۔ ڈاکٹر گب ہارڈ کا بیان ہے کہ ایسی عورتیں بہت کم مشاہدہ میں آئی ہیں جنکو زمانۂ حیض میں کوئی تکلیف نہ ہوتی ہو۔ بیشتر ایسی ہی دیکھی گئی ہیں جنہیں دردسر، تکان، زیر ناف درد اور بھوک کی کمی لاحق ہوتی ہے، طبیعت میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے، اور رونے کو جی چاہتا ہے۔"

ان حالات کے اعتبار سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ایام ماہواری میں ایک عورت دراصل بیمار ہوتی ہے۔ یہ ایک بیماری ہی ہے جو اسے ہر مہینہ لاحق ہوتی رہتی ہے۔

ان جسمانی تغیرات کا اثر لامحالہ عورت کے ذہنی قویٰ اور اس کے افعالِ اعضاء پر بھی پڑتا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں ڈاکٹر (Voicechevsky) نے گہرے مشاہدہ کے بعد یہ نتیجہ ظاہر کیا تھا کہ اس زمانہ میں عورت کے اندر مرکزیت خیال اور دماغی محنت کی طاقت کم ہوجاتی ہے۔ پروفیسر (Krschiskovsky) نفسیاتی مشاہدات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس زمانہ میں عورت کا نظام عصبی نہایت اشتعال پذیر ہوجاتا ہے۔ احساسات میں بلادت اور ناہمواری پیدا ہوجاتی ہے۔ مرتب انعکاسات کو قبول کرنیکی صلاحیت کم اور بسا اوقات باطل ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ پہلے سے حاصل شدہ مرتب انعکاسات میں بھی بدنظمی پیدا ہوجاتی ہے جسکی وجہ سے اسکے وہ افعال بھی درست نہیں رہتے جنکی وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں خوگر ہوتی ہے۔ ایک عورت جو ٹرام کی کنڈکٹر ہے اس زمانہ میں غلط ٹکٹ کاٹ دیگی اور ریزگاری گننے میں الجھے گی۔ ایک موٹر ڈرائیور عورت گاڑی آہستہ اور ڈرتے ڈرتے چلائے گی اور ہر موڑ پر گھبرا جائیگی۔ ایک لیڈی ٹائپسٹ غلط ٹائپ کریگی، دیر میں کریگی، کوشش کے باوجود الفاظ چھوڑ جائیگی، غلط جملے بنائیگی، کسی حرف پر انگلی مارنی چاہے گی اور ہاتھ کسی پر جا پڑے گا۔ ایک بیرسٹر عورت کی قوتِ استدلال درست نہ رہیگی اور اپنے مقدمہ کو پیش کرنے میں اس کا دماغ اور اسکی قوت بیان

دونوں غلطی کرینگے - ایک مجسٹریٹ عورت کی قوتِ فہم اور قوتِ فیصلہ دونوں متأثر ہو جائیں گی - ایک دندان ساز عورت کو اپنا کام کرتے وقت مطلوبہ اوزار مشکل سے ملینگے - ایک گانے والی عورت اپنے لہجہ اور آواز کی خوبی کو کھو دے گی، حتی کہ ایک ماہر نطقیات محض آواز سُن کر بتا دیگا کہ گانیوالی اسوقت حالتِ حیض میں ہے غرض یہ کہ اس زمانہ میں عورت کے دماغ اور اعصاب کی مشین بڑی حد تک سست اور غیر مرتب ہو جاتی ہے اسکے اعضا پوری طرح اسکے ارادے کے تحت عمل نہیں کر سکتے بلکہ اندر سے ایک اضطراری حرکت اسکے ارادے پر غالب آکر اسکی قوت ارادی اور قوت فیصلہ کو ماؤف کر دیتی ہے، اور اس سے مجبورانہ افعال سرزد ہونے لگتے ہیں - اس حالت میں اسکی آزادی عمل باقی نہیں رہتی، اور وہ کوئی ذمہ دارانہ کام کرنے کے قابل نہیں ہوتی -

پروفیسر لاپنسکی (Lapinsky) اپنی کتاب (The Development of Personality in Woman) میں لکھتا ہے کہ زمانہ حیض عورت کو اسکی آزادی عمل سے محروم کر دیتا ہے - وہ اس وقت اضطراری حرکات کی غلام ہوتی ہے اور اس میں بالارادہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی قوت بہت کم ہو جاتی ہے۔

یہ سب تغیرات ایک تندرست عورت میں ہوتے ہیں، اور بآسانی ترقی کر کے مرض کی صورت اختیار کر سکتے ہیں - ریکارڈ پر ایسے واقعات بکثرت موجود ہیں کہ اس حالت میں عورتیں دیوانی سی ہو جاتی ہیں - ذرا سے اشتعال پر غضبناک ہو جانا، وحشیانہ اور احمقانہ حرکات کر بیٹھنا، حتی کہ خودکشی تک کر گذرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں - ڈاکٹر کرافت ایبنگ (Krafft Ebing) لکھتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو عورتیں نرم مزاج، سلیقہ مند اور خوش خلق ہوتی ہیں ان کی حالت ایام ماہواری کے آتے ہی یکایک بدل جاتی ہے - یہ زمانہ انکے اوپر گویا ایک طوفان کی طرح آتا ہے - وہ چڑچڑی، جھگڑالو اور کٹ کھنی ہو جاتی ہیں، نوکر اور بچے اور شوہر سب ان سے نالاں ہوتے ہیں، حتی کہ وہ اجنبی لوگوں سے بھی بری طرح پیش آتی ہیں - بعض دوسرے اہلِ فن گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عورتوں سے اکثر جرائم حالتِ حیض میں سرزد ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس وقت اپنے قابو میں نہیں ہوتیں - ایک اچھی خاصی نیک عورت اس زمانے میں چوری کر گذرے گی اور بعد

میں خود اسکو اپنے فعل پر شرم آئیگی - وائن برگ (Weinberg) اپنے مشاہدات کی بنا پر لکھتا ہے کہ خودکشی کرنے والی عورتوں میں ۵۰ فیصدی ایسی پائی گئی ہیں جنہوں نے حالت حیض میں یہ فعل کیا ہے - اسی بنا پر ڈاکٹر کرافٹ ایبنگ کی رائے یہ ہے کہ بالغ عورتوں پر جب کسی جرم کی پاداش میں مقدمہ چلایا جائے تو عدالت کو اس امر کی تحقیق کر لینی چاہیے کہ یہ جرم کہیں حالت حیض میں تو نہیں کیا گیا ہے -

ایام ماہواری سے بھی بڑھ کر حمل کا زمانہ عورت پر سخت ہوتا ہے - ڈاکٹر ریپریف (Reprev) لکھتا ہے کہ حمل کے زمانہ میں عورت کے جسم سے فضلات کا اخراج بسا اوقات فاقہ زدگی کی حالت سے بھی زیادہ کم مقدار میں ہوتا ہے - اس زمانہ میں عورت کے قویٰ کسی طرح بھی جسمانی اور دماغی محنت کا وہ بار نہیں سنبھال سکتے جو حمل کے ماسوا دوسرے ایام میں سنبھال سکتے ہیں - جو حالات اس زمانہ میں عورت پر گذرتے ہیں وہ اگر مرد پر گذریں یا غیر زمانۂ حمل میں خود عورت پر گذریں تو قطعی بیماری کا حکم لگا دیا جائے - اس زمانہ میں کئی مہینے تک اس کا نظام عصبی مختل رہتا ہے - اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے - اس کے تمام عناصر روحی ایک مسلسل بدنظمی کی حالت میں ہوتے ہیں - وہ مرض اور صحت کے درمیان معلق رہتی ہے اور ایک ادنیٰ سی وجہ اسکو بیماری کی سرحد میں پہنچا سکتی ہے - ڈاکٹر فشر کا بیان ہے کہ ایک تندرست عورت بھی حمل کے زمانہ میں سخت نفسی اضطراب میں مبتلا رہتی ہے - اس میں تلوّن پیدا ہو جاتا ہے، خیالات پریشان رہتے ہیں، ذہن پراگندہ ہوتا ہے، شعور اور غور و فکر اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت بہت کم ہو جاتی ہے - ہیولاک ایلیس اور البرٹ مول اور بعض دوسرے ماہرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ زمانۂ حمل کا آخری ایک مہینہ تو ہرگز اس قابل نہیں ہوتا کہ اس میں عورت سے کوئی جسمانی یا دماغی محنت لی جائے -

وضع حمل کے بعد متعدد بیماریوں کے رونما ہونے اور ترقی کرنے کا اندیشہ رہتا ہے - زچگی کے زخم زہریلے اثرات قبول کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں - قبل حمل کی حالت کی طرف واپس جانے کے لیے اعضا میں ایک حرکت شروع ہوتی ہے جو سارے نظام جسمانی کو درہم برہم کر دیتی ہے - اگر کوئی خطرہ نہ بھی پیش آئے

تب بھی کئی ہفتے اسکو اپنی اصلی حالت پر آنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح استقرار حمل کے بعد سے پورے ایک سال تک عورت در حقیقت بیمار یا کم از کم نیم بیمار ہوتی ہے اور اس کی قوت کارکردگی عام حالات کی بہ نسبت آدھی بلکہ اس سے بھی کم ہو جاتی ہے۔

پھر رضاعت کا زمانہ ایسا ہوتا ہے جس میں در حقیقت وہ اپنے لیے نہیں جیتی بلکہ اُس امانت کے لیے جیتی ہے جو فطرت نے اسکے سپرد کی ہے۔ اسکے جسم کا جوہر اُسکے بچے کے لیے دودھ بنتا ہے۔ جو کچھ غذا وہ کھاتی ہے اس میں سے صرف اس قدر حصہ اسکے جسم کو ملتا ہے جس قدر اسے زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ باقی سب کا سب دودھ کی پیدائش میں صرف ہوتا ہے۔ اسکے بعد بھی ایک مدت دراز تک بچہ کی پرورش، نگہداشت اور تربیت پر اس کو تمام تر اپنی توجہ صرف کرنی پڑتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسئلہ رضاعت کا یہ حل نکالا گیا ہے کہ بچوں کو خارجی غذاؤں پر رکھا جائے۔ لیکن یہ کوئی صحیح حل نہیں ہے، اس لیے کہ فطرت نے بچہ کی پرورش کا جو سامان ماں کے سینے میں رکھ دیا ہے اسکا صحیح بدل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بچے کو اس سے محروم کرنا ظلم اور خود غرضی کے سوا کچھ نہیں۔ تمام ماہرین فن اس بات پر متفق ہیں کہ بچے کے صحیح نشو و نما کے لیے ماں کے دودھ سے بہتر کوئی غذا نہیں۔ اسی طرح تربیت اطفال کے لیے بھی نرسنگ ہوم اور تربیت گاہ اطفال کی تجویزیں نکالی گئی ہیں تاکہ مائیں اپنے بچوں سے بے فکر ہو کر بیرون خانہ کے مشاغل میں منہمک ہو سکیں۔ لیکن کسی نرسنگ ہوم اور کسی تربیت گاہ میں شفقت مادری فراہم نہیں کی جا سکتی۔ طفولیت کا ابتدائی زمانہ جس محبت، جس دردمندی اور جس خیر سگالی کا محتاج ہے وہ کرایہ کی پالنے پوسنے والیوں کے سینے میں کہاں سے آسکتی ہے۔ تربیت اطفال کے یہ جدید طریقے ابھی تک آزمودہ نہیں ہیں۔ ابھی وہ نسلیں پھل پھول بھی نہیں لائی ہیں جو بچے پالنے کے ان نئے کارخانوں میں تیار کی گئی ہیں۔ ابھی تک اُنکی سیرت، اُنکے اخلاق، اُنکے کارنامے دنیا کے سامنے نہیں آئے ہیں کہ اس تجربے کی کامیابی و ناکامی کے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ لہذا اس طریقہ کے متعلق یہ دعویٰ کرنا قبل از وقت ہے کہ دنیا نے ماں کی آغوش کا صحیح بدل پا لیا ہے۔ کم از کم اس وقت تک

تو یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ بچے کی فطری تربیت گاہ اسکی ماں کی آغوش ہی ہے۔

اب یہ بات ایک معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر عورت اور مرد دونوں کی جسمانی اور دماغی قوت و استعداد بالکل مساوی بھی ہے، تب بھی فطرت نے دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا ہے۔ بقائے نوع کی خدمت میں تخم ریزی کے سوا اور کوئی کام مرد کے سپرد نہیں کیا گیا۔ اسکے بعد وہ بالکل آزاد ہے کہ زندگی کے جس شعبے میں چاہے کام کرے۔ بخلاف اس کے اس خدمت کا پورا بار عورت پر ڈالدیا گیا ہے۔ اسی بار کے سنبھالنے کے لیے اس کو اس وقت سے مستعد کیا جاتا ہے جبکہ وہ ماں کے پیٹ میں محض ایک مضغۂ گوشت ہوتی ہے۔ اسی کے لیے اس کے جسم کی ساری مشین موزوں کی جاتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر جوانی کے پورے زمانے میں پیہم ایام ماہواری کے دور آتے ہیں جو ہر مہینے میں تین سے لیکر دس دن تک اسکو کسی بڑی ذمہ داری کا بار سنبھالنے اور کوئی اہم جسمانی یا دماغی محنت کرنے کے قابل نہیں رکھتے۔ اسی کے لیے اس پر حمل اور مابعد حمل کا پورا ایک سال سختیاں جھیلتے گذرتا ہے جس میں وہ درحقیقت نیم جان ہوتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر رضاعت کے پورے دو سال اس طرح گذرتے ہیں کہ وہ اپنے خون سے انسانیت کی کھیتی کو سینچتی اور اپنے سینے کی نہروں سے اسکو سیراب کرتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر بچے کی ابتدائی پرورش کے کئی سال اس محنت و مشقت میں گذرتے ہیں کہ اس پر رات کی نیند اور دن کی آسائش حرام ہوتی ہے اور وہ اپنی راحت، اپنے لطف، اپنی خوشی، اپنی خواہشات، غرض ہر چیز کو آنے والی نسل پر قربان کر دیتی ہے۔ جب حال یہ ہے تو غور کیجیے کہ عدل کا تقاضا کیا ہے؟ کیا عدل یہی ہے کہ عورت سے اُن فطری ذمہ داریوں کی بجا آوری کا مطالبہ بھی کیا جائے جن میں مرد اسکا شریک نہیں ہے، اور پھر اُن تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اس پر مرد کے برابر ڈال دیا جائے جن کو سنبھالنے کے لیے مرد فطرت کی تمام ذمہ داریوں سے آزاد رکھا گیا ہے؟ اس سے کہا جائے کہ تو وہ ساری مصیبتیں بھی برداشت کر جو فطرت نے تیرے اوپر ڈالی ہیں اور ہمارے ساتھ آکر روزی کمانے کی مشقتیں بھی اٹھا، سیاست اور عدالت اور صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت اور قیام امن اور مدافعتِ وطن کی خدمتوں میں بھی

برابر کا حصہ لے ، ہماری سوسائیٹی میں آکر ہمارا دل بھی بہلا ، ہمارے لیے عیش و مسرت اور لطف و لذت کے سامان بھی فراہم کرے ؟ یہ عدل نہیں ظلم ہے ، مساوات نہیں صریح نامساوات ہے ۔ عدل کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیئے کہ جس پر فطرت نے بہت زیادہ بار ڈالا ہے اسکو تمدن کے ہلکے اور سبک کام سپرد کیے جائیں ۔ اور جس پر فطرت نے کوئی بار نہیں ڈالا اس پر تمدن کی اہم اور زیادہ محنت طلب ذمہ داریوں کا بار ڈالا جائے ، اور اسی کے سپرد یہ خدمت بھی کی جائے کہ وہ خاندان کی پرورش اور اسکی حفاظت کرے ۔

صرف یہی نہیں کہ عورت پر بیرون خانہ کی ذمہ داریاں ڈالنا ظلم ہے ، بلکہ درحقیقت وہ اُن مردانہ خدمات کو انجام دینے کی پوری طرح اہل بھی نہیں ہے جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے ۔ ان کاموں کے لیے وہی کارکن موزوں ہو سکتے ہیں جنکی قوت کارکردگی پائیدار ہو ، جو مسلسل اور علی الدوام اپنے فرائض کو یکساں اہلیت کے ساتھ انجام دے سکتے ہوں ، اور جنکی دماغی و جسمانی قوتوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہو ۔ لیکن جن کارکنوں پر ہمیشہ ہر مہینہ ایک کافی مدت کے لیے عدم اہلیت یا کمی اہلیت کے دورے پڑتے رہیں ، اور جنکی قوت کارکردگی بار بار معیار مطلوب سے گھٹ جایا کرے ، وہ کس طرح ان ذمہ داریوں کا بار اٹھا سکتے ہیں ؟ اُس فوج یا اُس بحری بیڑے کی حالت کا اندازہ کیجیے جو عورتوں پر مشتمل ہو اور جس میں عین موقع کارزار پر کئی فیصدی تو ایام ماہواری کی وجہ سے نیم بیکار ہو رہی ہوں ، ایک اچھی خاصی تعداد زچگی کی حالت میں بستروں پر پڑی ہو ، اور ایک معتدبہ جماعت حاملہ ہونے کی وجہ سے ناقابلِ کار ہو رہی ہو ۔ فوج کی مثال کو آپ کہدینگے کہ یہ زیادہ سخت قسم کے فرائض سے تعلق رکھتی ہے ۔ مگر پولیس ، عدالت ، انتظامی محکمے ، سفارتی خدمات ، ریلوے ، صنعت و حرفت اور تجارت کے کام ، اِن میں سے کس کی ذمہ داریاں ایسی ہیں جو مسلسل قابلِ اعتماد کارکردگی کی اہلیت نہ چاہتی ہوں ؟ پس جو لوگ عورتوں سے مردانہ کام لینا چاہتے ہیں ان کا مطلب شاید یہ ہے کہ یا تو سب عورتوں کو ناعورت بنا کر نسل انسانی کا خاتمہ کر دیا جائے ، یا یہ کہ ان میں سے چند فیصدی لازماً ناعورت بننے کی سزا کے لیے منتخب کی جاتی رہیں ، یا یہ کہ تمام معاملات تمدن کے لیے اہلیت کا معیار بالعموم گھٹا دیا جائے ۔

مگر خواہ آپ ان میں سے کوئی صورت بھی اختیار کریں، عورت کو مردانہ کاموں کے لیے تیار کرنا عین اقتضائے فطرت اور وضع فطرت کے خلاف ہے، اور یہ چیز نہ انسانیت کے لیے مفید ہے نہ خود عورت کے لیے۔ چونکہ علم الحیات کی رو سے عورت کو بچہ کی پیدائش اور پرورش ہی کے لیے بنایا گیا ہے، اسلیے نفسیات کے دائرے میں بھی اسکے اندر وہی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں جو اسکے فطری وظیفہ کے لیے موزوں ہیں یعنی محبت، ہمدردی، رحم وشفقت، رقت قلب، ذکاوتِ حس اور لطافت جذبات۔ اور چونکہ صنفی زندگی میں مرد کو فعل کا اور عورت کو انفعال کا مقام دیا گیا ہے اسلیے عورت کے اندر تمام تر وہی صفات پیدا کی گئی ہیں جو اسے زندگی کے صرف منفعلانہ پہلو میں کام کرنے کے لیے تیار کرتی ہیں۔ اسکے اندر سختی اور شدت کے بجائے نرمی اور نزاکت اور لچک ہے۔ اس میں اثراندازی کے بجائے اثر پذیری ہے، فعل کے بجائے انفعال ہے، جمنے اور ٹھیرنے کے بجائے جھکنے اور ڈھل جانے کی صلاحیت ہے، بے باکی اور جسارت کے بجائے منع وفرار اور رکاوٹ ہے۔ کیا ان خصوصیات کو لیکر وہ کبھی ان کاموں کے لیے موزوں ہو سکتی ہے، اور ان دوائر حیات میں کامیاب ہو سکتی ہے جو شدت، تحکم، مزاحمت اور سرد مزاجی چاہتے ہیں، جن میں نرم جذبات کے بجائے ٹھنڈی قوت فیصلہ کی ضرورت ہے، جن میں عطوفت اور میلان طبع کے بجائے مضبوط ارادے اور بے لاگ رائے کی ضرورت ہے؟ تمدن کے ان شعبوں میں عورت کو گھسیٹ لانا خود اسکو بھی ضائع کرنا ہے اور ان شعبوں کو بھی۔

اس میں عورت کے لیے ارتقا نہیں بلکہ انحطاط ہے۔ ارتقا اسکو نہیں کہتے کہ کسی کی قدرتی صلاحیتوں کو دبایا اور مٹایا جائے۔ اور اس میں مصنوعی طور پر وہ صلاحیتیں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جو فطری طور پر اسکے اندر نہ ہوں۔ بلکہ ارتقا اس کا نام ہے کہ قدرتی صلاحیتوں کو نشو ونما دیا جائے، ان کو نکھارا اور چمکایا جائے، اور انکے لیے بہتر سے بہتر عمل کے مواقع پیدا کیے جائیں۔

اس میں عورت کے لیے کامیابی نہیں بلکہ ناکامی ہے۔ زندگی کے ایک پہلو میں عورتیں کمزور ہیں اور مرد بڑھے ہوئے ہیں۔ دوسرے پہلو میں مرد کمزور ہیں اور عورتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ تم غریب عورتوں

کو اس پہلو میں مردوں کے مقابلہ پر لاتے ہو جس میں وہ کمزور ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ عورتیں ہمیشہ مردوں سے کمتر رہینگی۔ تم خواہ کتنی ہی تدبیریں کرلو، ممکن نہیں ہے کہ عورتوں کی صنف سے ارسطو، ابن سینا، کانٹ، ہیگل، خیام، شیکسپیر، اسکندر، نپولین، صلاح الدین، نظام الملک طوسی، اور بسمارک کی ٹکر کا ایک فرد بھی پیدا ہو سکے۔ البتہ تمام دنیا کے مرد چاہے کتنا ہی سر مار لیں، وہ اپنی پوری صنف میں سے ایک معمولی درجہ کی ماں بھی پیدا نہیں کرسکتے۔

اس میں خود تمدن کا بھی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے۔ انسانی زندگی اور تہذیب کو جتنی ضرورت غلظت، شدت اور صلابت کی ہے اتنی ہی ضرورت رقت، نرمی اور لچک کی بھی ہے۔ جتنی ضرورت اچھے سپہ سالاروں، اچھے مدبروں، اور اچھے منتظمین کی ہے، اتنی ہی ضرورت اچھی ماؤں، اچھی بیویوں، اور اچھی خانہ داروں کی بھی ہے۔ دونوں عنصروں میں سے جسکو بھی ساقط کیا جائیگا تمدن بہرحال نقصان اٹھائیگا۔

یہ وہ تقسیم عمل ہے جو خود فطرت نے انسان کی دونوں صنفوں کے درمیان کردی ہے۔ حیاتیات، عضویات، نفسیات اور عمرانیات کے تمام علوم اس تقسیم کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔ عورت کے سپرد بچہ جننے اور پالنے کی خدمت کا سپرد ہونا ایک ایسی فیصلہ کن حقیقت ہے جو خود بخود انسانی تمدن میں اسکے لیے ایک دائرۂ عمل مخصوص کردیتی ہے، اور کسی مصنوعی تدبیر میں یہ طاقت نہیں ہے کہ فطرت کے اس فیصلہ کو بدل سکے۔ ایک صالح تمدن وہی ہوسکتا ہے جو اولاً اس فیصلہ کو جوں کا توں قبول کرے، پھر عورت کو اسکے صحیح مقام پر رکھ کر اسے معاشرت میں عزت کا مرتبہ دے، اس کے جائز تمدنی و معاشی حقوق تسلیم کرے، اس پر صرف گھر کی ذمہ داری کا بار ڈالے، اور بیرون خانہ کی ذمہ داریاں اور خاندان کی قوامیت مرد کے سپرد کرے۔ جو تمدن اس تقسیم کو مٹانے کی کوشش کرے گا وہ عارضی طور پر مادی حیثیت سے ترقی اور شان و شوکت کے کچھ مظاہر پیش کرسکتا ہے، لیکن بالآخر ایسے تمدن کی بربادی یقینی ہے، کیونکہ جب عورت پر مرد کے برابر معاشی و تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا جائیگا تو وہ اپنے اوپر سے فطری ذمہ داریوں کا بوجھ اتار پھینکے گی

اور اسکا نتیجہ نہ صرف تمدن بلکہ خود انسانیت کی بربادی ہوگا۔ عورت اپنی افتادِ طبع اور اپنی فطری ساخت کے خلاف اگر کوشش کرے تو کسی نہ کسی حد تک مرد کے سب کاموں کا بوجھ سنبھال لے جائیگی۔ لیکن مرد کسی طرح بھی اپنے آپ کو بچے جننے اور بچے پالنے کے قابل نہیں بنا سکتا۔

فطرت کی اس تقسیم عمل کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاندان کی جو تنظیم اور معاشرت میں مرد و عورت کے وظائف کی جو تعیین کی جائیگی اس کے ضروری ارکان لامحالہ حسب ذیل ہونگے:

(۱) خاندان کے لیے روزی کمانا، اسکی حمایت و حفاظت کرنا، اور تمدن کی محنت طلب خدمات انجام دینا مرد کا کام ہو، اور اسکی تعلیم و تربیت ایسی ہو کہ وہ ان اغراض کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکے۔

(۲) بچوں کی پرورش، خانہ داری کے فرائض، اور گھر کی زندگی کو سکون و راحت کی جنت بنانا عورت کا کام ہو اور اسکو بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت دیکر انہی اغراض کے لیے تیار کیا جائے۔

(۳) خاندان کے نظم کو برقرار رکھنے اور اسکو طوائف الملوکی سے بچانے کے لیے ایک فرد کو قانونی حدود کے اندر ضروری حاکمانہ اختیارات حاصل ہوں تاکہ خاندان ایک بن سری فوج بن کر نہ رہ جائے۔ ایسا فرد صرف مرد ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ جس رکن خاندان کی دماغی اور قلبی حالت بار بار ایام ماہواری اور حمل کے زمانہ میں بگڑتی ہو وہ تو بہرحال ان اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

(۴) تمدن کے نظام میں اس تقسیم اور ترتیب و تنظیم کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تحفظات رکھے جائیں تاکہ بے عقل افراد اپنی حماقت سے عورتوں اور مردوں کے حلقہائے عمل مخلوط کرکے اس صالح تمدنی نظام کو درہم برہم نہ کر سکیں۔

انسانی کوتاہیاں

گذشتہ صفحات میں خالص علمی تحقیق اور سائنٹفک مشاہدات و تجربات کی مدد سے ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسانی فطرت کے مقتضیات اور انسان کی ذہنی افتاد اور جسمانی ساخت کی تمام دلالتوں کا لحاظ کر کے تمدن کا ایک صحیح نظام مرتب کیا جائے تو صنفی معاملات کی حد تک اسکے ضروری اصول وارکان کیا ہونے چاہئیں۔ اس بحث میں کوئی چیز ایسی بیان نہیں کی گئی ہے جو متشابہات میں سے ہو، یا جس میں کسی کلام کی گنجائش ہو۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ علم وحکمت کے محکمات میں سے ہے اور عموماً سب ہی اہل علم وعقل اس سے واقف ہیں۔ لیکن انسانی عجز کا کمال دیکھیے کہ جتنے نظام تمدن خود انسان نے وضع کیے ہیں ان میں سے ایک میں بھی فطرت کی ان معلوم ومعروف ہدایات کو بہ تمام وکمال اور بحسن تناسب ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان خود اپنی فطرت کے مقتضیات سے ناواقف نہیں ہے اس سے خود اپنی ذہنی کیفیات اور جسمانی خصوصیات چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ مگر اسکے باوجود یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ آج تک وہ کوئی ایسا معتدل نظام تمدن وضع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا جسکے اصول ومناہج میں پورے توازن کے ساتھ ان سب مقتضیات وخصوصیات اور سب مصالح ومقاصد کی رعایت کی گئی ہو۔

نارسائی کی حقیقی علت اس کی وجہ وہی ہے جسکی طرف ہم اس کتاب کی ابتدا میں اشارہ کر چکے ہیں۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ اسکی نظر کسی معاملے کے تمام پہلوؤں پر من حیث الکل حاوی نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ کوئی ایک پہلو اسے زیادہ اپیل کرتا ہے اور اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پھر جب وہ ایک طرف مائل ہو جاتا ہے تو دوسرے اطراف یا تو اسکی نظر سے بالکل ہی اوجھل ہو جاتے ہیں یا وہ قصداً ان کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ زندگی کے جزئی اور انفرادی معاملات تک میں انسان کی یہ کمزوری نمایاں نظر آتی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ تمدن وتہذیب

کے وسیع تر مسائل، جن میں سے ہر ایک اپنے اندر بے شمار جلی و خفی گوشے رکھتا ہے، اس کمزوری کے اثر سے محفوظ رہ جائیں۔ علم اور عقل کی دولت سے انسان کو ضرور سرفراز کیا گیا ہے مگر عموماً زندگی کے معاملات میں خالص عقلیت اسکی رہنما نہیں ہوتی۔ جذبات اور رجحانات پہلے اسکو ایک رُخ پر موڑ دیتے ہیں، پھر جب وہ اس خاص رُخ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تب عقل سے استدلال کرتا ہے اور علم سے مدد لیتا ہے۔ اس حالت میں اگر خود اسکا علم اسکو معاملے کے دوسرے رُخ دکھائے اور اسکی اپنی عقل اسکی یک رُخی پر متنبہ کرے تب بھی وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا بلکہ علم و عقل کو مجبور کرتا ہے کہ اسکے رجحان کی تائید میں دلائل اور تاویلات فراہم کریں۔

چند نمایاں مثالیں معاشرت کے جس مسئلے سے اس وقت ہم بحث کر رہے ہیں، اس میں انسان کی یہی یک رُخی اپنی افراط و تفریط کی پوری شان کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے۔

ایک گروہ اخلاق اور روحانیت کے پہلو کی طرف جھکا اور اس میں یہاں تک غلو کر گیا کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق ہی کو سرے سے ایک قابلِ نفرت چیز قرار دے بیٹھا۔ یہی بے اعتدالی ہم کو بودھ مت، مسیحیت اور بعض ہندو مذاہب میں نظر آتی ہے۔ اور اسی کا اثر ہے کہ ابتک دنیا کے ایک بڑے حصہ میں صنفی تعلق کو بجائے خود ایک بدی سمجھا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ ازدواج کے دائرہ میں ہو یا اس سے باہر۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ کہ رہبانیت کی غیر فطری اور غیر متمدن زندگی کو اخلاق اور طہارت نفس کا نصب العین سمجھا گیا۔ نوع انسانی کے بہت سے افراد نے جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو فطرت سے انحراف بلکہ جنگ میں ضائع کر دیا۔ اور جو لوگ اقتضائے فطرت سے مجبور ہو کر باہم ملے بھی تو اس طرح جیسے کوئی شخص مجبوراً اپنی کسی گندی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تعلق نہ تو زوجین کے درمیان محبت اور تعاون کا تعلق بن سکتا ہے اور نہ اس سے کوئی صالح اور ترقی پذیر تمدن وجود میں آسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نظام معاشرت میں عورت کے مرتبہ کو گرانے کی ذمہ داری بھی بڑی حد تک اسی نام نہاد اخلاقی تصور پر ہے۔ رہبانیت کے پرستاروں نے صنفی

کشش کو شیطانی وسوسہ، اور اس کشش کی محرک، یعنی عورت کو شیطان کا ایجنٹ قرار دیا، اور اس کو ایک ایسا ناپاک وجود ٹھیرایا جس سے نفرت کرنا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو طہارت نفس چاہتا ہو۔ مسیحی، بودھ اور ہندو لٹریچر میں عورت کا یہی تصور غالب ہے۔ اور جو نظام معاشرت اس تصور کے تحت مرتب کیا گیا ہو اس میں عورت کا جیسا کچھ مرتبہ ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

اس کے برعکس دوسرے گروہ نے انسان کے داعیات جسمانی کی رعایت کی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ فطرت انسانی تو درکنار، فطرت حیوانی کے مقتضیات کو بھی نظر انداز کر دیا۔ مغربی تمدن میں یہ کیفیت اس قدر نمایاں ہو چکی ہے کہ اب چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ اسکے قانون میں زنا کوئی جرم ہی نہیں، جرم اگر ہے تو جبر و اکراہ ہے یا کسی دوسرے شخص کے قانونی حق میں مداخلت۔ ان دونوں میں سے کسی جرم کی مشارکت نہ ہو تو زنا (یعنی صنفی تعلقات کا انتشار) بجائے خود کوئی قابل تعزیر جرم، حتی کہ کوئی قابل شرم اخلاقی عیب بھی نہیں۔ یہاں تک تو وہ کم از کم حیوانی فطرت کی حد میں تھا۔ لیکن اسکے بعد وہ اس سے بھی آگے بڑھا۔ اس نے صنفی تعلق کے حیوانی مقصد یعنی تناسل اور بقائے نوع کو بھی نظر انداز کر دیا، اور اسے محض جسمانی لطف و لذت کا ذریعہ بنالیا۔ یہاں پہنچ کر وہی انسان جو احسن تقویم پر پیدا کیا گیا تھا، اسفل سافلین میں پہنچ جاتا ہے۔ پہلے وہ اپنی انسانی فطرت سے انحراف کر کے حیوانات کا سا منتشر صنفی تعلق اختیار کرتا ہے جو کسی تمدن کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ پھر وہ اپنی حیوانی فطرت سے بھی انحراف کرتا ہے اور اس تعلق کے فطری نتیجہ، یعنی اولاد کی پیدائش کو بھی روک دیتا ہے، تاکہ دنیا میں اسکی نوع کو باقی رکھنے والی نسلیں وجود ہی میں نہ آنے پائیں۔

ایک جماعت نے خاندان کی اہمیت کو محسوس کیا تو اسکی تنظیم اس قدر سخت بندشوں کے ساتھ کی کہ ایک ایک فرد کو جکڑ کر رکھدیا اور حقوق و فرائض میں کوئی توازن ہی باقی نہ رکھا۔ اسکی ایک نمایاں مثال ہندوؤں کا خاندانی نظام ہے۔ اس میں عورت کے لیے ارادے اور عمل کی کوئی آزادی نہیں۔ تمدن اور معیشت میں اسکا کوئی حق نہیں۔ وہ لڑکی ہے تو لونڈی ہے۔ بیوی ہے تو لونڈی ہے۔ ماں ہے تو لونڈی ہے۔

بیوہ ہے تو لونڈی سے بھی بدتر زندہ درگور ہے۔ اسکے حصہ میں صرف فرائض ہی فرائض ہیں، حقوق کے خانے میں ایک عظیم الشان صفر کے سوا کچھ نہیں۔ اس نظام معاشرت میں عورت کو ابتدا ہی سے ایک بے زبان جانور بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس میں سرے سے اپنی خودی کا کوئی شعور پیدا ہی نہ ہو۔ بلاشبہ اس طریقہ سے خاندان کی بنیادوں کو بہت مضبوط کر دیا گیا اور عورت کی بغاوت کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ لیکن جماعت کے پورے نصف حصہ کو ذلیل اور پست کر کے اس نظام معاشرت نے درحقیقت اپنی تعمیر میں خرابی کی ایک صورت اور بڑی خطرناک صورت پیدا کر دی جسکے نتائج کو اب خود ہندو بھی محسوس کر رہے ہیں۔

ایک دوسری جماعت نے عورت کے مرتبے کو بلند کرنے کی کوشش کی اور اسکو ارادہ و عمل کی آزادی بخشی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ خاندان کا شیرازہ ہی درہم برہم کر دیا۔ بیوی ہے تو آزاد۔ بیٹی ہے تو آزاد۔ بیٹا ہے تو آزاد۔ خاندان کا درحقیقت کوئی سردھرا نہیں۔ کسی کو کسی پر اقتدار نہیں۔ بیوی سے شوہر نہیں پوچھ سکتا کہ تو نے رات کہاں بسر کی۔ بیٹی سے باپ نہیں پوچھ سکتا کہ تو کس سے ملتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ زوجین درحقیقت دو برابر کے دوست ہیں جو مساوی شرائط کے ساتھ مل کر ایک گھر بناتے ہیں، اور اولاد کی حیثیت اس ایسوسی ایشن میں محض جونیئر ممبرس کی سی ہے۔ مزاج اور طبائع کی ایک ادنیٰ ناموافقت اس بنے ہوئے گھر کو ہر وقت بگاڑ سکتی ہے، کیونکہ اطاعت کا ضروری عنصر، جو ہر نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر ہے، اس جماعت میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہ مغربی معاشرت ہے، وہی مغربی معاشرت جسکے علمبرداروں کو اصول تمدن و عمران میں پیغمبری کا دعویٰ ہے۔ انکی پیغمبری کا صحیح حال آپ کو دیکھنا ہو تو یورپ اور امریکہ کی کسی عدالت نکاح و طلاق یا کسی عدالت جرائم اطفال (Juvenile Court) کی روداد اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ابھی حال میں انگلستان کے ہوم آفس سے جرائم کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سن لڑکوں اور لڑکیوں میں جرائم کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے، اور اس کی خاص وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ خاندان کا ڈسپلن بہت کمزور ہو گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو Blue Book of Crime Statistics for 1934

انسان اور خصوصاً عورت کی فطرت میں شرم وحیا کا جو مادہ رکھا گیا ہے اسکو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور عملاً لباس اور طرز معاشرت کے اندر اسکی صحیح ترجمانی کرنے میں تو کسی انسانی تمدن کو کامیابی نہیں ہوئی شرم وحیا کو انسان اور خاص کر عورت کی بہترین صفات میں سے شمار کیا گیا ہے۔ مگر لباس و معاشرت میں اس کا ظہور کسی عقلی طریقے اور کسی ہموار ضابطہ کی صورت میں نہیں ہوا۔ ستر عورت کے صحیح حدود متعین کرنے اور یکسانی کے ساتھ انکو ملحوظ رکھنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ مردوں اور عورتوں کے لباس اور انکے آداب و اطوار میں حیا داری کی صورتیں کسی اصول کے تحت مقرر نہیں کی گئیں۔ معاشرت میں مرد اور مرد، عورت اور عورت، مرد اور عورت کے درمیان کشف وحجاب کی مناسب اور معقول حد بندی کی ہی نہیں گئی۔ تہذیب و شائستگی اور اخلاق عامہ کے نقطۂ نظر سے یہ معاملہ جتنا اہم تھا، اتنا ہی اسکے ساتھ تغافل برتا گیا۔ اسکو کچھ تو رسم و رواج پر چھوڑ دیا گیا، حالانکہ رسم و رواج اجتماعی حالات کے ساتھ بدل جانے والی چیز ہے، اور کچھ افراد کے ذاتی رجحان و انتخاب پر منحصر کر دیا گیا، حالانکہ نہ جذبۂ شرم وحیا کے اعتبار سے تمام اشخاص یکساں ہیں اور نہ ہر شخص اتنی سلامت ذوق اور صحیح قوت انتخاب رکھتا ہے کہ اپنے اس جذبہ کے لحاظ سے خود کوئی مناسب طریقہ اختیار کر سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مختلف جماعتوں کے لباس اور معاشرت میں حیاداری اور بے حیائی کی عجیب آمیزش نظر آتی ہے جس میں کوئی عقلی مناسبت، کوئی یکسانی، کوئی ہمواری، کسی اصول کی پابندی نہیں پائی جاتی۔ مشرقی ممالک میں تو یہ چیز صرف بے ڈھنگے پن ہی تک محدود رہی۔ لیکن مغربی قوموں کے لباس اور معاشرت میں جب بے حیائی کا عنصر حد سے زیادہ بڑھا تو انہوں نے سرے سے شرم وحیا کی جڑ ہی کاٹ دی۔ ان کا جدید نظریہ یہ ہے کہ "شرم وحیا دراصل کوئی فطری جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ محض لباس پہننے کی عادت نے اسکو پیدا کر دیا ہے۔ ستر عورت اور حیاداری کا کوئی تعلق اخلاق اور شائستگی سے نہیں ہے بلکہ وہ تو درحقیقت انسان کے داعیات صنفی کو تحریک دینے والے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔"[1] اسی فلسفہ بے حیائی کی عملی تفسیریں ہیں وہ نیم عریاں

---

[1] یہ بلفظہٖ وہی خیال ہے جو ویسٹر مارک (Westermarck) نے اپنی کتاب (The History of Human Marriage) میں ظاہر کیا ہے۔

لباس، وہ جسمانی حسن کے مقابلے، وہ برہنہ ناچ، وہ ننگی تصویریں، وہ اسٹیج پر فاحشانہ مظاہرے، وہ برہنگی (Nudism) کی روز افزوں تحریک، وہ حیوانیتِ محض کی طرف انسان کی واپسی۔

یہی بے اعتدالی اس مسئلہ کے دوسرے اطراف میں بھی نظر آتی ہے:

جن لوگوں نے اخلاق اور عصمت کو اہمیت دی انہوں نے عورت کی حفاظت ایک جاندار، ذی عقل، ذی روح وجود کی حیثیت سے نہیں کی، بلکہ ایک بے جان زیور، ایک قیمتی پتھر کی طرح کی، اور اسکی تعلیم و تربیت کے سوال کو نظر انداز کر دیا، حالانکہ تہذیب و تمدن کی بہتری کے لیے یہ سوال عورت کے حق میں بھی اتنا ہی اہم تھا جتنا مرد کے لیے تھا۔ بخلاف اسکے جنہوں نے تعلیم و تربیت کی اہمیت کو محسوس کیا انہوں نے اخلاق اور عصمت کی اہمیت کو نظر انداز کر کے ایک دوسری حیثیت سے تمدن و تہذیب کی تباہی کا سامان مہیا کر دیا۔

جن لوگوں نے فطرت کی تقسیم عمل کا لحاظ کیا انہوں نے تمدن و معاشرت کی خدمات میں سے عورت پر صرف خانہ داری اور تربیت اطفال کی ذمہ داریاں عائد کیں اور مرد پر رزق مہیا کرنے کا بار ڈالا۔ لیکن اس تقسیم میں وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ انہوں نے عورت سے تمام معاشی حقوق سلب کر لیے۔ وراثت میں اسکو کسی قسم کا حق نہ دیا، ملکیت کے تمام حقوق مرد کی طرف منتقل کر دیے، اور اس طرح معاشی حیثیت سے عورت کو بالکل بے دست و پا کر کے عورت اور مرد کے درمیان درحقیقت لونڈی اور آقا کا تعلق قائم کر دیا۔ اسکے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ اٹھا جس نے اس بے انصافی کی تلافی کرنی چاہی، اور عورت کو اسکے معاشی و تمدنی حقوق دلانے کا ارادہ کیا، مگر یہ لوگ ایک دوسری غلطی کے مرتکب ہو گئے۔ انکے دماغوں پر مادیت کا غلبہ تھا اس لیے انہوں نے عورت کو معاشی و تمدنی غلامی سے نجات دلانے کے معنی یہ سمجھے کہ اسکو بھی مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا فرد بنا دیا جائے، اور تمدن کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں مرد کے ساتھ برابر شریک کیا جائے۔ مادیت کے نقطۂ نظر سے اس طریقہ میں بڑی جاذبیت تھی، کیونکہ اس سے نہ صرف مرد کا بار ہلکا ہو گیا بلکہ کسب معیشت میں عورت کے شریک ہو جانے سے دولت کے حصول اور اسباب عیش کی فراہمی میں قریب قریب دو چند کا اضافہ

بھی ہوگیا - مزید براں قوم کی معاشی اور عمرانی مشین کو چلانے کے لیے پہلے کے مقابلے میں دوگنے ہاتھ اور دوگنے دماغ مہیا ہو گئے جس سے یکایک تمدن کے ارتقار کی رفتار تیز ہوگئی - لیکن مادی اور معاشی پہلو کی طرف اس قدر حد سے زیادہ مائل ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پہلو جو درحقیقت اپنی اہمیت میں اس ایک پہلو سے کچھ کم نہ تھے، ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور بہت سے پہلوؤں کو انہوں نے جانتے بوجھتے نظر انداز کر دیا - انہوں نے قانون فطرت کو جاننے کے باوجود قصداً اسکی خلاف ورزی کی جس پر خود انکی اپنی سائنٹیفک تحقیقات شہادت دے رہی ہے - انہوں نے عورت کے ساتھ انصاف کرنیکا دعویٰ کیا مگر درحقیقت بے انصافی کے مرتکب ہوئے جس پر خود ان کے اپنے مشاہدات اور تجربات گواہ ہیں - انہوں نے عورت کو مساوات دینے کا ارادہ کیا مگر درحقیقت نامساوات قائم کر بیٹھے جسکا ثبوت خود ان کے اپنے علوم وفنون فراہم کر رہے ہیں - انہوں نے تمدن و تہذیب کی اصلاح کرنی چاہی، مگر درحقیقت اسکی تخریب کے نہایت خوفناک اسباب پیدا کر دیے جنکی تفصیلات خود انہی کے بیان کردہ واقعات اور خود ان کے اپنے فراہم کردہ اعداد و شمار سے ہم کو معلوم ہوئی ہیں - ظاہر ہے کہ وہ ان حقائق سے بے خبر نہیں ہیں، مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ انسانی کمزوری ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کے لیے قانون بنانے میں تمام مصلحتوں کی معتدل اور متناسب رعایت ملحوظ نہیں رکھ سکتا - ہوائے نفس اسکو افراط کے کسی ایک رخ پر بہالے جاتی ہے، اور جب وہ بہہ جاتا ہے تو بہت سی مصلحتیں اسکی نظر سے چھپ جاتی ہیں، اور بہت سی مصلحتوں اور حقیقتوں کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود وہ انکی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے - اس قصدی و ارادی اندھے پن کے ثبوت میں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے کہ خود ایک ایسے اندھے ہی کی شہادت پیش کر دیں - روس کا ایک ممتاز سائنس داں انتون نیملاف (Anton Nemilov) جو سو فیصدی کمیونسٹ ہے اپنی کتاب (The Biological Tragedy of Woman [۱]) میں سائنس کے تجربات اور مشاہدات سے خود ہی عورت اور مرد کی فطری نامساوات ثابت کرنے پر تقریباً دو سو صفحے سیاہ کرتا ہے، مگر پھر خود ہی اس تمام سائنٹیفک تحقیق کے بعد لکھتا ہے :-

[۱] اس کتاب کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے۔ ۵۲

"آج کل اگر یہ کہا جائے کہ عورت کو نظام اجتماعی میں محدود حقوق دیئے جائیں تو کم آدمی اسکی تائید کرینگے۔ ہم خود اس تجویز کے سخت مخالف ہیں۔ مگر ہمیں اپنے نفس کو یہ دھوکا نہ دینا چاہیے کہ مساواتِ مرد و زن کو عملی زندگی میں قائم کرنا کوئی سادہ اور آسان کام ہے۔ دنیا میں کہیں بھی عورت اور مرد کو برابر کر دینے کی اتنی کوشش نہیں کی گئی جتنی سوویٹ روس میں کی گئی ہے۔ کسی جگہ اس باب میں اس قدر غیر متعصبانہ اور فیاضانہ قوانین نہیں بنائے گئے۔ مگر اسکے باوجود واقعہ یہ ہے کہ عورت کی حقیقی پوزیشن خاندان میں بہت کم بدل سکی ہے" (صفحہ ۷۶)

نہ صرف خاندان میں بلکہ سوسائٹی میں بھی:-

"اب تک عورت اور مرد کی نامساوات کا تخیل، نہایت گہرا تخیل، نہ صرف ان طبقوں میں جو ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کے ہیں، بلکہ اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ سوویٹ طبقوں میں بھی جما ہوا ہے، اور خود عورتوں میں اس تخیل کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اگر انکے ساتھ ٹھیٹھ مساوات کا سلوک کیا جائے تو وہ اس کو مرد کے مرتبہ سے گرا ہوا سمجھینگی، بلکہ اسے مرد کی کمزوری اور نامردی پر محمول کرینگی۔ اگر ہم اس معاملہ میں کسی سائنٹسٹ، کسی مصنف، کسی طالب علم، کسی تاجر، یا کسی سو فیصدی کمیونسٹ کے خیالات کا تجسس کریں تو بہت جلدی یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی کہ وہ عورت کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتا۔ اگر ہم زمانۂ حال کے کسی ناول کو پڑھیں، خواہ وہ کیسے ہی آزاد خیال مصنف کا لکھا ہوا ہو یقیناً اس میں ہم کو کہیں نہ کہیں ایسی عبارتیں ملیں گی جو عورت کے متعلق اس تخیل کی چغلی کھا جائینگی۔" (صفحہ ۹۵-۱۹۴)

اس کی وجہ؟

"اسکی وجہ یہ ہے کہ یہاں انقلابی اصول ایک نہایت اہم صورتِ واقعی سے ٹکرا جاتے ہیں، یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں ہے، اور دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا گیا ہے۔" (صفحہ ۷۷)

ایک اقتباس اور دیکھ لیجیے، پھر نتیجہ آپ خود نکال لیں گے:۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ تمام عمال (Workers) میں صنفی انتشار (Sexual anarchy) کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں - یہ ایک نہایت پرخطر حالت ہے جو سوشلسٹ نظام کو تباہ کر دینے کی دھمکی دے رہی ہے - ہر ممکن طریقہ سے اسکا مقابلہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس محاذ پر جنگ کرنے میں بڑی مشکلات ہیں - میں ہزارہا ایسے واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہوانی بے قیدی (Sexual licentiousness) نہ صرف ناواقف لوگوں میں بلکہ طبقۂ عمال کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عقلی حیثیت سے ترقی یافتہ افراد میں بھی پھیل گئی ہے۔" (صفحہ ۲۰۲-۳)

ان عبارتوں کی شہادت کیسی کھلی ہوئی شہادت ہے - ایک طرف یہ اعتراف ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان خود فطرت نے مساوات نہیں رکھی، عملی زندگی میں بھی مساوات قائم کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں، اور جس حد تک فطرت سے لڑ کر اس قسم کی مساوات قائم کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فواحش کا ایک سیلاب امنڈ آیا جس سے سوسائیٹی کا سارا نظام خطرہ میں پڑ گیا - دوسری طرف یہ دعویٰ ہے کہ نظام اجتماعی میں عورت کے حقوق پر کسی قسم کی حد بندیاں نہ ہونی چاہئیں اور اگر ایسا کیا جائے گا تو ہم اسکی سخت مخالفت کرینگے - اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس امر کا ہو گا کہ انسان ـــ جاہل نہیں بلکہ عالم، عاقل، نہایت باخبر انسان بھی ـــ اپنے نفس کے رجحانات کا اتنا غلام ہوتا ہے کہ خود اپنی تحقیق کو جھٹلاتا ہے، اپنے مشاہدات کی نفی کرتا ہے، اور سب طرف سے آنکھیں بند کر کے ہوائے نفس کے پیچھے ایک ہی رخ پر انتہا کو پہنچ جاتا ہے، خواہ اس افراط کے خلاف اسکے اپنے علوم کتنی ہی محکم دلیلیں پیش کریں، اسکے کان کتنے ہی واقعات سن لیں، اور اسکی آنکھیں کتنے ہی برے نتائج کا مشاہدہ کر لیں - اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (الجاثیہ : ۲)

قانونِ اسلام کی شانِ اعتدال بے اعتدالی اور افراط و تفریط کی اس دنیا میں صرف ایک نظامِ تمدن ایسا ہے جس میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ جس میں فطرتِ انسانی کے ایک ایک پہلو حتی کہ نہایت خفی پہلو کی بھی رعایت کی گئی ہے، انسان کی جسمانی ساخت، اور اس کی حیوانی جبلت، اور اس کی انسانی سرشت، اور اس کی نفسی خصوصیات، اور اس کے فطری داعیات کے نہایت مکمل اور تفصیلی علم سے کام لیا گیا ہے، اور ان میں سے ایک ایک چیز کی تخلیق سے فطرت کا جو مقصد ہے اس کو تمام و کمال اس طریقہ سے پورا کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے مقصد حتی کہ چھوٹے سے چھوٹے مقصد کو بھی نقصان نہیں پہنچا، اور بالآخر یہ سب مقاصد مل کر اُس بڑے مقصد کی تکمیل میں مددگار ہوتے ہیں جو خود انسان کی زندگی کا مقصد ہے یہ اعتدال، یہ توازن، یہ تناسب اتنا مکمل ہے کہ کوئی انسان خود اپنی عقل اور کوشش سے اس کو پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ انسان کا وضع کیا ہوا قانون ہو اور اس میں کسی جگہ بھی یک رُخی نہ ظاہر ہو، ناممکن! قطعی ناممکن!! خود وضع کرنا تو درکنار، حقیقت یہ ہے کہ معمولی انسان تو اس معتدل و متوازن اور انتہائی حکیمانہ قانون کی حکمتوں کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتا جب تک کہ وہ غیر معمولی سلامت طبع نہ رکھتا ہو اور اس پر سالہا سال تک علوم اور تجربات کا اکتساب کرے اور پھر برسوں غور و خوض نہ کرتا رہے۔ میں اس قانون کی تعریف اسلیے نہیں کرتا ہوں کہ میں اسلام پر ایمان لایا ہوں، بلکہ دراصل میں اسلام پر ایمان لایا ہی اس وجہ سے ہوں کہ مجھے اس میں کمال درجہ کا توازن اور تناسب اور قوانینِ فطرت کے ساتھ تطابق نظر آتا ہے جسے دیکھ کر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یقیناً اس قانون کا واضع وہی ہے جو زمین و آسمان کا فاطر اور غیب و شہادت کا عالم ہے، اور حق یہ ہے کہ مختلف سمتوں میں بہک جانے والے بنی آدم کو عدل و توسط کا محکم طریقہ وہی بتا سکتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (الزمر: ۵)

اِسلامی نظامِ معاشرت

اساسی نظریات

یہ بات اسلام کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اپنے قانون کی حکمت پر بھی خود ہی روشنی ڈالتا ہے۔ معاشرت میں عورت اور مرد کے تعلقات کو منضبط کرنے کے لیے جو قانون اسلام میں پایا جاتا ہے اس کے متعلق خود اسلام ہی نے ہم کو بتا دیا ہے کہ اس قانون کی بنیاد کن اصولِ حکمت اور کن حقائقِ فطرت پر ہے۔

زوجیت کا اساسی مفہوم | اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت جس کی پردہ کشائی کی گئی ہے، یہ ہے:-

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (الذاریات - ۴) اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے ہیں۔

اس آیت میں قانون زوجی (Law of Sex) کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کارگاہ عالم کا انجنیر خود اپنی انجنیری کا یہ راز کھول رہا ہے کہ اس نے کائنات کی یہ ساری مشین قاعدۂ زوجیت پر بنائی ہے، یعنی اس مشین کے تمام کل پرزے جوڑوں (Pairs) کی شکل میں بنائے گئے ہیں، اور اس جہانِ خلق میں جتنی کاریگری تم دیکھتے ہو وہ سب انہی جوڑوں کی تزویج کا کرشمہ ہے۔

اب اس پر غور کرو کہ زوجیت کیا شے ہے۔ زوجیت میں اصل یہ ہے کہ ایک شئے میں فعل ہو اور دوسری شئے میں قبول و انفعال۔ ایک شئے میں تاثیر ہو اور دوسری شئے میں تأثر۔ ایک شئے میں عاقدیت ہو اور دوسری شئے میں منعقدیت۔ یہی عقد و انعقاد، اور فعل و انفعال، اور تاثیر و تأثر اور فاعلیت و قابلیت کا تعلق دو چیزوں کے درمیان زوجیت کا تعلق ہے۔ اسی تعلق سے تمام ترکیبات واقع ہوتی ہیں۔ اور انہی ترکیبات سے عالم خلق کا سارا کارخانہ چلتا ہے۔ کائنات میں جتنی چیزیں ہیں

وہ سب کے سب اپنے طبقہ میں زوج زوج اور جوڑ جوڑ پیدا ہوئی ہیں، اور ہر دو زوجین کے درمیان اصلی، و اساسی حیثیت سے زوجیت کا یہی تعلق پایا جاتا ہے کہ ایک فاعل ہے اور دوسرا قابل و منفعل۔ اگرچہ مخلوقات کے ہر طبقے میں اس تعلق کی کیفیت مختلف ہو جاتی ہے، مثلاً ایک تزویج وہ ہے جو بسائط اور عناصر میں ہوتی ہے، ایک وہ جو مرکبات غیر نامیہ میں ہوتی ہے، ایک وہ جو اجسام نامیہ میں ہوتی ہے، ایک وہ جو انواعِ حیوانی میں ہوتی ہے۔ یہ سب تزویجیں اپنی نوعیت اور کیفیت اور فطری مقاصد کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ لیکن اصلِ زوجیت ان سب میں وہی ایک ہے۔ ہر نوع میں، خواہ وہ کسی طبقہ کی ہو، فطرت کے اصل مقصد، یعنی وقوعِ ترکیب اور حصولِ ہیئت ترکیبی کے لیے ناگزیر ہے کہ زوجین میں سے ایک میں قوتِ فعل ہو اور دوسرے میں قوتِ انفعال۔

آیت مذکورۂ بالا کا یہ مفہوم متعین ہو جانے کے بعد اس سے قانونِ زوجیت کے تین ابتدائی اصول مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے جس فارمولے پر تمام کائنات کی تخلیق کی ہے اور جس طریقے کو اپنے اس کارخانے کے چلنے کا ذریعہ بنایا، وہ ہرگز ناپاک اور ذلیل نہیں ہو سکتا بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ پاک اور محترم ہی ہے اور ہونا چاہیے۔ کارخانہ کے مخالف اسکو گندہ اور قابلِ نفرت قرار دے کر اس سے اجتناب کر سکتے ہیں، مگر خود کارخانہ کا صانع اور مالک تو یہ کبھی نہ چاہیگا کہ اسکا کارخانہ بند ہو جائے۔ اسکا منشا تو یہی ہے کہ اسکی مشین کے تمام پرزے چلتے رہیں اور اپنے اپنے حصے کا کام پورا کریں۔

۲۔ فعل اور انفعال دونوں اس کارخانے کو چلانے کے لیے یکساں ضروری ہیں۔ فاعل اور منفعل دونوں کا وجود اس کارگاہ میں یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ نہ فاعل کی حیثیت فعلی میں کوئی عزت ہے اور نہ منفعل کی حیثیت انفعالی میں کوئی ذلت۔ فاعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں قوتِ فعل اور کیفیات فاعلیہ پائی جائیں تاکہ وہ زوجیت کے فعلی پہلو کا کام بخوبی ادا کر سکے۔ اور منفعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں انفعال اور کیفیات انفعالیہ بدرجۂ اتم موجود ہوں تاکہ وہ زوجیت کے انفعالی اور قبولی پہلو کی خدمت باحسن وجوہ بجا لا سکے۔ ایک معمولی مشین کے پرزے کو بھی اگر کوئی شخص اسکے اصلی مقام سے ہٹا دے اور اس سے وہ کام لینا چاہے جسکے لیے وہ

دراصل بنایا ہی نہیں گیا ہے، تو وہ احمق اور اناڑی سمجھا جائیگا۔ اول تو اپنی اس کوشش میں اسے کامیابی ہی نہ ہوگی اور اگر وہ بہت زور لگائیگا تو بس اتنا کرسکیگا کہ مشین کو توڑدے۔ ایسا ہی حال کائنات کی اس عظیم الشان مشین کا بھی ہے۔ جو احمق اور اناڑی ہیں وہ اس کے زوج فاعل کو زوج منفعل کی جگہ، یا زوج منفعل کو زوج فاعل کی جگہ رکھنے کا خیال کرسکتے ہیں، اور اسکی کوشش کرکے اور اس میں کامیابی کی امید رکھ کر مزید حماقت کا ثبوت بھی دے سکتے ہیں۔ مگر اس مشین کا صانع تو ہرگز ایسا نہ کریگا۔ وہ تو فاعل پرزے کو فعل ہی کی جگہ رکھیگا اور اسی حیثیت سے اسکی تربیت کریگا۔ اور منفعل پرزے کو انفعال ہی کی جگہ رکھیگا اور اس میں انفعالی استعداد ہی پرورش کرنیکا انتظام کریگا۔

۲- فعل اپنی ذات میں قبول و انفعال پر بہر حال ایک طرح کی فضیلت رکھتا ہے۔ یہ فضیلت اس معنی میں نہیں ہے کہ فعل میں عزت ہو اور انفعال اسکے مقابلہ میں ذلیل ہو۔ بلکہ یہ فضیلت دراصل غلبہ اور قوت اور اثر کے معنی میں ہے۔ جو شئے کسی دوسری شے پر فعل کرتی ہے وہ اسی وجہ سے تو کرتی ہے کہ وہ اس پر غالب ہے، اُسکے مقابلہ میں طاقتور ہے، اور اس پر اثر کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ اور جو شے اس کے فعل کو قبول کرتی اور اس سے منفعل ہوتی ہے اسکے قبول و انفعال کی وجہ یہی تو ہے کہ وہ مغلوب ہے، اسکے مقابلہ میں کمزور ہے، اور متاثر ہونے کی استعداد رکھتی ہے۔ جس طرح وقوعِ فعل کے لیے فاعل اور منفعل دونوں کا وجود یکساں ضروری ہے، اُسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ فاعل میں غلبہ اور قوتِ تاثیر ہو اور منفعل میں مغلوبیت اور قبولِ اثر کی استعداد۔ کیونکہ اگر دونوں قوت میں یکساں ہوں اور کسی کو کسی پر غلبہ حاصل نہ ہو تو ان میں سے کوئی کسی کا اثر قبول نہ کریگا اور سرے سے فعل واقع ہی نہ ہوگا۔ اگر کپڑے میں بھی وہی سختی ہو جو سوئی میں ہے تو سینے کا فعل پورا نہیں ہوسکتا۔ اگر زمین میں وہ نرمی نہ ہو جسکی وجہ سے وہ کدال اور ہل کا غلبہ قبول کرتی ہے تو زراعت اور تعمیر ناممکن ہوجائے۔ غرض دنیا میں جتنے افعال واقع ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی واقع نہیں ہوسکتا اگر ایک فاعل کے مقابلہ میں ایک منفعل نہ ہو اور منفعل میں فاعل کے اثر سے مغلوب ہونے کی صلاحیت نہ ہو۔

پس زوجین میں سے زوجِ فاعل کی طبیعت کا اقتضا یہی ہے کہ اس میں غلبہ اور شدت اور تحکم ہو جسکو مردانگی و رجولیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ فعلی پرزے کی حیثیت سے اپنی خدمت بجالانے کے لیے اس کا ایسا ہی ہونا ضروری ہے۔ اسکے برعکس زوجِ منفعل کی فطرتِ انفعالیہ کا یہی اقتضا ہے کہ اس میں نرمی اور نزاکت اور لطافت اور تأثر ہو جسے انوثت یا نسائیت کہا جاتا ہے، کیونکہ زوجیت کے انفعالی پہلو میں یہی صفات اس کو کامیاب بنا سکتی ہیں جو لوگ اس راز کو نہیں جانتے وہ یا تو فاعل کی ذاتی فضیلت کو عزت کا ہم معنی سمجھ کر منفعل کو بالذات ذلیل قرار دے بیٹھتے ہیں، یا پھر سرے سے اس فضیلت کا انکار کر کے منفعل میں بھی وہی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو فاعل میں ہونی چاہئیں۔ لیکن جس انجنیر نے ان دونوں پرزوں کو بنایا ہے وہ انکو مشین میں اس طور پر نصب کرتا ہے کہ عزت میں دونوں یکساں، اور تربیت و عنایت میں دونوں برابر، مگر فعل و انفعال کی طبیعت جس غالبیت و مغلوبیت کی مقتضی ہے وہی ان میں پیدا ہو تاکہ وہ تزوج کے منشا کو پورا کر سکیں، نہ یہ کہ دونوں ایسے پتھر بن جائیں جو ٹکرا تو سکتے ہیں مگر آپس میں کوئی امتزاج اور کوئی ترکیب قبول نہیں کر سکتے۔

یہ وہ اصول ہیں جو زوجیت کے ابتدائی مفہوم ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ محض ایک مادّی وجود ہونے کی حیثیت سے عورت اور مرد کا زوج زوج ہونا ہی اس کا مقتضی ہے کہ انکے تعلقات میں یہ اصول مرعی رکھے جائیں چنانچہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا کہ فاطر السموٰت والارض نے جو قانون معاشرت بنایا ہے اس میں ان تینوں کی پوری رعایت کی گئی ہے۔

انسان کی حیوانی فطرت اور اسکے مقتضیات اب ایک قدم آگے بڑھیے۔ عورت اور مرد کا وجود محض ایک مادّی وجود ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک حیوانی وجود بھی ہے۔ اس حیثیت سے ان کا زوج زوج ہونا کس چیز کا مقتضی ہے؟ قرآن کہتا ہے:۔

جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ (الشوریٰ-۲)

"اللہ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے اور جانوروں میں سے بھی جوڑے بنائے۔ اس طریقہ سے وہ تم کو روئے زمین پر پھیلاتا ہے"۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ (بقرہ: ۳۰) "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں"۔

پہلی آیت میں انسان اور حیوان دونوں کے جوڑے بنانے کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور اس کا مشترک مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے زوجی تعلق سے تناسل کا سلسلہ جاری ہو۔ دوسری آیت میں انسان کو عام حیوانات سے الگ کرکے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انواع حیوانات میں سے اس خاص نوع کے زوجین میں کھیتی اور کسان کا سا تعلق ہے۔ یہ ایک حیاتی حقیقت (Biological fact) ہے، اور حیاتیات کے نقطہ نظر سے بہترین تشبیہ جو عورت اور مرد کو دی جا سکتی ہے وہ یہی ہے۔ ان دونوں آیتوں سے تین مزید اصول حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات کی طرح انسان کے جوڑے بھی اس مقصد کے لیے بنائے ہیں کہ ان کے صنفی تعلق سے انسانی نسل جاری ہو۔ یہ انسان کی حیوانی فطرت کا مقتضا ہے جس کی رعایت ضروری ہے۔ خدا نے نوع انسانی کو اس لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ اس کے چند افراد زمین پر اپنے نفس کی پرورش کریں اور بس ختم ہو جائیں، بلکہ اس کا ارادہ ایک اجلِ معین تک اس نوع کو باقی رکھنے کا ہے، اور اس نے انسان کی حیوانی فطرت میں صنفی میلان اسی لیے رکھا ہے کہ اس کے زوجین باہم ملیں اور خدا کی زمین کو آباد رکھنے کے لیے اپنی نسل جاری کریں۔ پس جو قانون خدا کی طرف سے ہوگا وہ کبھی صنفی میلان کو کچلنے اور فنا کرنے والا نہیں ہو سکتا، اس سے نفرت اور کلی اجتناب کی تعلیم دینے والا نہیں ہو سکتا، بلکہ اس میں لازماً ایسی گنجائش رکھی جائے گی کہ انسان اپنی فطرت کے اس اقتضا کو پورا کر سکے۔

۲۔ عورت اور مرد کو کھیتی اور کسان سے تشبیہ دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زوجین کا تعلق دوسرے حیوانات کے زوجین سے مختلف ہے۔ انسانی حیثیت سے قطع نظر، حیوانی اعتبار سے بھی ان دونوں کی ترکیب جسمانی اس طور پر رکھی گئی ہے کہ ان کے تعلق میں وہ پائداری ہونی چاہیے جو کسان اور اس کے کھیت میں ہوتی ہے

جس طرح کھیتی میں کسان کا کام محض بیج پھینکدینا ہی نہیں ہے بلکہ اسکے ساتھ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ اسکو پانی دے، کھاد مہیا کرے، اور اسکی حفاظت کرتا رہے، اسی طرح عورت بھی وہ زمین نہیں ہے جس میں ایک جانور چلتے پھرتے کوئی بیج پھینک جائے اور وہ ایک خود رو درخت اُگا دے، بلکہ جب وہ بارور ہوتی ہے تو درحقیقت اسکی محتاج ہوتی ہے کہ اُس کا کسان اُسکی پرورش اور اُس کی رکھوالی کا پورا بار سنبھالے۔

۳۔ انسان کے زوجین میں جو صنفی کشش ہے وہ حیاتی (Biological) حیثیت سے اُسی نوع کی ہے جو دوسری انواع حیوانی میں پائی جاتی ہے۔ ایک صنف کا ہر فرد صنف مقابل کے ہر فرد کی طرف حیوانی میلان رکھتا ہے اور تناسل کا زبردست داعیہ، جو ان کی سرشت میں رکھا گیا ہے، دونوں صنفوں کے اُن تمام افراد کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے جن میں تناسل کی صلاحیت بالفعل موجود ہو۔ پس فاطر کائنات کا بنایا ہوا قانون، انسان کی حیوانی فطرت کے اِس کمزور پہلو سے بے پرواہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس میں صنفی انتشار (Sexual anarchy) کی طرف ایسا شدید میلان چھپا ہوا ہے جو تحفظ کی خاص تدابیر کے بغیر قابو میں نہیں رکھا جاسکتا، اور ایک مرتبہ اگر وہ بے قابو ہوجائے تو انسان کو پورا حیوان بلکہ حیوانات میں بھی سب سے ارذل بن جانے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔

فطرت انسانی اور اس کے مقتضیات جیساکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، طبیعت حیوانیہ، خلقت انسانی کی تہ میں زمین اور بنیاد کے طور پر ہے، اور اسی زمین پر انسانیت کی عمارت قائم کی گئی ہے۔ انسان کے انفرادی وجود اور اسکی نوعی ہستی، دونوں کو باقی رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں سے ہر ایک کی خواہش اور ہر ایک کے حصول کی استعداد اللہ تعالیٰ نے اسکی حیوانی سرشت میں رکھدی ہے،

اور فطرتِ الٰہی کا منشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ اِن خواہشات میں سے کسی خواہش کو پورا ہونے دیا جائے یا اِن استعدادات میں سے کسی استعداد کو فنا کر دیا جائے، کیونکہ یہ سب چیزیں بہرحال ضروری ہیں اور اِن کے بغیر انسان اور اسکی نوع زندہ نہیں رہ سکتی۔ البتہ فطرتِ حق یہ چاہتی ہے کہ انسان اپنی اِن خواہشات کو پورا کرنے اور اِن استعدادات سے کام لینے میں نرا حیوانی طریقہ نہ اختیار کرے، بلکہ اُسکی انسانی سرشت جن امور کی مقتضی ہے اور اُس میں جن فوق الحیوانی امور کی طلب رکھی گئی ہے، اُن کے لحاظ سے اُس کا طریقہ انسانی ہونا چاہیے اسی غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے حدودِ شرعی مقرر فرمائی ہیں، تاکہ انسان کے افعال کو ایک ضابطہ کا پابند بنایا جائے۔ اور اسکے ساتھ یہ تنبیہ بھی کر دی گئی ہے کہ اگر افراط یا تفریط کا طریقہ اختیار کر کے ان حدود سے تجاوز کرو گے تو اپنے آپ کو خود تباہ کر لو گے وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (الطلاق: ۱)

اب دیکھیے کہ صنفی معاملات میں قرآن مجید انسانی فطرت کی کن خصوصیات اور کن مقتضیات کی طرف اشارہ کرتا ہے:

(۱) دونوں صنفوں کے درمیان جس قسم کا تعلق انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اُس کی تشریح یہ ہے:۔

خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم: ۲)

اللہ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور اس نے تمہارے درمیان مودت اور رحمت رکھ دی ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرہ۔ ۲۳)

وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

اس سے پہلے جس آیت میں انسان اور حیوان دونوں کے لیے جوڑے بنانے کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا تھا وہاں تخلیق زوجین کا مقصد صرف بقائے نسل بتایا گیا تھا۔ اب حیوان سے الگ کرکے انسان کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ اس میں زوجیت کا ایک بالاتر مقصد بھی ہے، اور وہ یہ کہ ان کا تعلق محض شہوانی تعلق نہ ہو بلکہ محبت اور انس کا تعلق ہو، دل کے لگاؤ اور روحوں کے اتصال کا تعلق ہو، وہ ایک دوسرے کے رازدار اور شریک رنج وراحت ہوں، اُن کے درمیان ایسی معیّت اور دائمی وابستگی ہو جیسی لباس اور جسم میں ہوتی ہے۔ دونوں صنفوں کا یہ تعلق انسانی تمدن کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے جیسا کہ ہم تفصیل بیان کر چکے ہیں۔ اس کے ساتھ لِتَسْكُنُوٓا اِلَيْهَا سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ عورت کی ذات میں مرد کے لیے سرمایہ سکون وراحت ہے، اور عورت کی فطری خدمت یہی ہے کہ وہ اس جدو جہد اور ہنگامۂ عمل کی مشقتوں بھری دنیا میں سکون وراحت کا ایک گوشہ مہیا کرے۔ یہ انسان کی خانگی زندگی ہے جس کی اہمیت کو مادّی منفعتوں کی خاطر اہل مغرب نے نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ تمدن وعمران کے شعبوں میں جو اہمیت دوسرے شعبوں کی ہے وہی اس شعبے کی بھی ہے، اور تمدنی زندگی کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنے دوسرے شعبے ضروری ہیں۔

(۲) یہ صنفی تعلق صرف زوجین کی باہمی محبت ہی کا مقتضی نہیں ہے، بلکہ اس امر کا بھی مقتضی ہے کہ اس تعلق سے جو اولاد پیدا ہو اسکے ساتھ بھی ایک گہرا روحانی تعلق ہو۔ فطرتِ الٰہی نے اس کے لیے انسان کی اور خصوصاً عورت کی جسمانی ساخت اور حمل ورضاعت کی طبیعی صورت ہی میں ایسا انتظام کیا ہے کہ اسکی رگ رگ اور ریشے ریشے میں اولاد کی محبت پیوست ہو جاتی ہے، چنانچہ قرآن مجید کہتا ہے:

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ	اس کی ماں نے اسکو جھٹکے پر جھٹکے اٹھا کر پیٹ میں رکھا
وَّفِصٰلُهٗ فِىْ عَامَيْنِ (لقمان: ۲)	پھر دو سال کے بعد وہ ماں کی چھاتی سے جدا ہوا
حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ	اس کی ماں نے اسکو تکلیف کے ساتھ پیٹ

كُرْهًا وَّحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا۔ (الاحقاف : ۲)

میں رکھا تکلیف کے ساتھ جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑائی میں تیس مہینے صرف ہوئے۔

ایسا ہی حال مرد کا ہے، اگرچہ اولاد کی محبت میں وہ عورت سے کمتر ہے :-

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ (آل عمران ۲۱)

لوگوں کے لیے خوش آیند ہے مرغوب چیزوں کی محبت جیسے عورتیں، اولاد اور ....

یہی فطری محبت انسان اور انسان کے درمیان نسبی اور صہری رشتے قائم کرتی ہے، پھر ان رشتوں سے خاندان اور خاندانوں سے قبائل اور قومیں بنتی ہیں، اور اُن کے تعلقات سے تمدن وجود میں آتا ہے :-

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا (الفرقان : ۵)

اور وہ خدا ہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا پھر اسکو نسب اور شادی بیاہ کا رشتہ بنایا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات : ۳)

لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

پس ارحام اور انساب اور مصاہرت کے رشتے دراصل انسانی تمدن کے ابتدائی اور طبیعی مؤسسات ہیں اور انکی قیام کا انحصار اس پر ہے کہ اولاد اپنے معلوم و معروف ماں باپ سے ہو اور انساب محفوظ ہوں۔

(۳) انسانی فطرت کا اقتضاء یہ بھی کہ وہ اپنی محنتوں کے نتائج اور اپنی گاڑھی کمائی میں سے اگر کچھ چھوڑے تو اپنی اولاد اور اپنے اُن عزیزوں کے لیے چھوڑے جن کے ساتھ وہ تمام عمر خونی اور رحمی رشتوں میں بندھا رہا ہے۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ۔ (الانفال : ۱۰)

اور اللہ کے قانون میں رشتہ دار ایک دوسرے کی وراثت کے زیادہ حق دار ہیں۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَ كُمْ اَبْنَاءَ كُمْ۔ (الاحزاب - ۱) جن کو تم منہ بولا بیٹا بنا لیتے ہو اُن کو خدا نے تمہارا بیٹا نہیں بنایا ہے۔

پس تقسیم میراث کے لیے بھی تحفظ انساب کی ضرورت ہے۔

(۴) انسان کی فطرت میں حیاء کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اسکے جسم کے بعض حصے ایسے ہیں جنکے چھپانے کی خواہش خدا نے اسکی جبلت میں پیدا کی ہے، اور یہی جبلی خواہش ہے جس نے ابتدا سے انسان کو کسی نہ کسی نوع کا لباس اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس باب میں قرآن قطعیت کے ساتھ جدید نظریہ کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی جسم کے جن حصوں میں مرد اور عورت کے لیے صنفی جاذبیت ہے، ان کے اظہار میں شرم کرنا اور ان کو چھپانے کی کوشش کرنا انسانی فطرت کا اقتضاء ہے، البتہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ وہ ان کو کھول دے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا... پھر شیطان نے آدم اور ان کی بیوی کو بہکایا تاکہ ان کے جسم میں سے جو کچھ ان سے چھپایا گیا تھا اس کو ان پر ظاہر کر دے

...فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (الاعراف: ۲) ..... پس جب انہوں نے اس شجر کا مزا چکھا تو ان پر انکے جسم کے پوشیدہ حصے کھل گئے اور وہ ان کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔

پھر قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے لباس اسی لیے اتارا ہے کہ وہ تمہارے لیے ستر پوشی کا ذریعہ بھی ہو اور زینت کا ذریعہ بھی مگر محض ستر چھپا لینا کافی نہیں، اس کے ساتھ ضروری ہے کہ تمہارے دلوں میں تقویٰ بھی ہو۔ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (الاعراف: ۳)۔

یہ اسلامی نظام معاشرت کے اساسی تصورات ہیں۔ ان تصورات کو ذہن نشین کرکے

سکے بعد اب اُس نظام معاشرت کی تفصیلی صورت ملاحظہ کیجیے جو ان تصورات کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ کے دوران میں آپ کو گہری نظر سے اس امر کا تجسس کرنا چاہیے کہ اسلام جن نظریات کو اپنے قانون کی اساس قرار دیتا ہے انکو عملی جزئیات و تفصیلات میں نافذ کرتے ہوئے کہاں تک یکسانی و ہمواری اور منطقی ربط و مطابقت قائم رکھتا ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے جتنے قوانین ہم نے دیکھے ہیں ان سب کی یہ مشترک اور نمایاں کمزوری ہے کہ اُن کے اساسی نظریات اور عملی تفصیلات کے درمیان پورا منطقی ربط قائم نہیں رہتا۔ اصول اور فروع میں صریح تناقض پایا جاتا ہے۔ کلیات جو بیان کیے جاتے ہیں ان کا مزاج کچھ اور ہوتا ہے، اور عملدرآمد کے لیے جو جزئیات مقرر کیے جاتے ہیں ان کا مزاج کوئی اور صورت اختیار کر لیتا ہے۔ فکر و تعقل کے آسمانوں پر چڑھ کر ایک نظریہ پیش کر دیا جاتا ہے مگر جب عالم بالا سے اتر کر واقعات اور عمل کی دنیا میں آدمی اپنے نظریہ کو عمل کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے تو یہاں عملی مسائل میں وہ کچھ ایسا کھویا جاتا ہے کہ اسے خود اپنا نظریہ یاد نہیں رہتا۔ انسانی ساخت کے قوانین میں سے کوئی ایک قانون بھی اس کمزوری سے خالی نہیں پایا گیا۔ اب آپ دیکھیں، اور خوردبین لگا کر انتہائی نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھیں کہ یہ قانون جو ریگستان عرب کے ایک اَن پڑھ چرواہے نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے ـــــ جس کے مرتب کرنے میں اس نے کسی مجلس قانون ساز اور کسی سلکٹ کمیٹی سے مشورہ تک نہیں لیا ـــــ اس میں بھی کہیں کوئی منطقی بے ربطی اور کسی تناقض کی جھلک پائی جاتی ہے؟

اسلامی نظامِ معاشرت[۲]

اصول و ارکان

تنظیم معاشرت کے سلسلہ میں سب سے اہم سوال، جیسا کہ ہم کسی دوسرے موقع پر بیان کر چکے ہیں، صنفی میلان کو انتشارِ عمل سے روک کر ایک ضابطہ میں لانے کا ہے۔ کیونکہ اسکے بغیر تمدن کی شیرازہ بندی ہی نہیں ہو سکتی، اور اگر ہو بھی جائے تو اس شیرازے کو بکھرنے اور انسان کو شدید اخلاق و ذہنی انحطاط سے بچانے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس غرض کے لیے اسلام نے عورت اور مرد کے تعلقات کو مختلف حدود کا پابند کر کے ایک مرکز پر سمیٹ دیا ہے۔

محرمات سب سے پہلے اسلامی قانون اُن تمام مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے لیے حرام کرتا ہے جو باہم مل کر رہنے یا نہایت قریبی تعلقات رکھنے پر مجبور ہیں، مثلاً ماں اور بیٹا، باپ اور بیٹی، بھائی اور بہن، پھوپھی اور بھتیجا، چچا اور بھتیجی، خالہ اور بھانجا، ماموں اور بھانجی، سوتیلا باپ اور بیٹی، سوتیلی ماں اور بیٹا، ساس اور داماد، خسر اور بہو، سالی اور بہنوئی (بہن کی زندگی میں)، اور رضاعی رشتہ دار (سورۂ نساء۔ رکوع ۴)۔ ان تعلقات کی حرمت قائم کر کے انکو صنفی میلان سے اس قدر پاک کر دیا گیا ہے کہ ان رشتوں کے مرد اور عورت یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ایک دوسرے کی جانب کوئی صنفی کشش رکھتی ہیں (بجز ایسے خبیث طینت بہائم کے جنکی بہیمیت کسی اخلاقی ضابطہ کی حد میں رہنا قبول نہیں کرتی)۔

حرمت زنا اس حد بندی کے بعد دوسری قید یہ لگائی گئی کہ ایسی تمام عورتیں بھی حرام ہیں جو بالفعل کسی دوسرے شخص کے نکاح میں ہوں (وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاۗءِ (سورۃ نساء: ۴)

ان کے بعد جو عورتیں باقی بچتی ہیں ان کے ساتھ ہر قسم کے بے ضابطہ صنفی تعلق کو حرام کردیا گیا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۴)

زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو کیونکہ وہ بے حیائی ہے اور بہت برا راستہ ہے۔

نکاح اس طرح حدود و قیود لگا کر صنفی انتشار کے تمام راستے بند کر دیے گئے۔ مگر انسان کی حیوانی سرشت کے اقتضا اور کارخانۂ قدرت کے مقرر طریقہ کو جاری رکھنے کے لیے ایک دروازہ کھولنا بھی ضرور تھا، سو وہ دروازہ نکاح کی صورت میں کھولا گیا، اور کہہ دیا گیا کہ اس ضرورت کو تم پورا کرو، مگر منتشر اور بے ضابطہ تعلقات میں نہیں، چوری چھپے بھی نہیں، کھلے بندوں بے حیائی کے طریقہ پر بھی نہیں، بلکہ باقاعدہ اعلان و اظہار کے ساتھ تاکہ تمہاری سوسائٹی میں یہ بات معلوم اور مسلّم ہو جائے کہ فلاں مرد اور عورت ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ...... فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ ...... مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (النساء: ۴)

ان عورتوں کے سوا جو عورتیں ہیں، تمہارے لیے حلال کیا گیا کہ تم اپنے اموال کے بدلے میں (مہر دیکر) ان سے احصان (نکاح) کا باضابطہ تعلق قائم کرو نہ کہ آزاد شہوت رانی کا ...... پس ان عورتوں کے متعلقین کی رضامندی سے ان کے ساتھ نکاح کرو ...... اس طرح کہ وہ قیدِ نکاح میں ہوں نہ یہ کہ کھلے بندوں یا چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں۔

یہاں اسلام کی شان اعتدال دیکھیے کہ جو صنفی تعلق دائرۂ ازدواج کے باہر حرام اور قابلِ نفرت تھا وہی دائرۂ ازدواج کے اندر نہ صرف جائز، بلکہ مستحسن ہے، کارِ ثواب ہے، اسکو اختیار کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اس سے اجتناب کرنے کو ناپسند کیا جاتا ہے اور زوجین کا ایسا تعلق ایک عبادت بن جاتا ہے حتیٰ کہ اگر عورت اپنے شوہر کی جائز خواہش سے بچنے کے لیے نفل روزہ رکھ لے، یا نماز و تلاوت میں مشغول ہو جائے تو وہ الٹی گنہگار ہوگی۔ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند حکیمانہ اقوال ملاحظہ ہوں:-

علیکم بالباءة فانه اغض للبصر واحصن للفرج فمن لم یستطع منکم الباءة فعلیه بالصوم فان الصوم له وجاء (الترمذی ابواب النکاح - وفی هذا المعنی حدیث فی کتاب النکاح للبخاری)

تم کو نکاح کرنا چاہیے کیونکہ وہ آنکھوں کی شرارت سے روکنے اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔ اور جو شخص تم سے نکاح کی قدرت نہ رکھتا ہو اس کو روزہ رکھنا چاہیے کیونکہ روزہ شہوت کو دبانے والا ہے۔

واللہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم له لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی (بخاری کتاب النکاح)

بخدا کہ میں خدا سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے میں تم سب سے بڑھ کر ہوں، مگر مجھے دیکھو کہ روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں نماز بھی پڑھتا ہوں اور راتوں کو سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں یہ میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقہ سے اجتناب کرے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔

لا تصوم المرأة وبعلها شاهد الا باذنه (بخاری باب صوم المرأة باذن زوجها)

عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کے اذن کے بغیر نفل روزہ نہ رکھے۔

اذا باتت المرأة مهاجرة فراش زوجها لعنتها الملائکة حتی ترجع۔ (بخاری کتاب النکاح)

جو عورت اپنے شوہر سے اجتناب کرکے اس سے الگ رات گذارے اس پر ملائکہ لعنت بھیجتے ہیں جب تک کہ وہ رجوع نہ کرے۔

اذا رأی احدکم امرأة فاعجبته فلیأت اهله فان معها مثل الذی معها (ترمذی - باب ماجاء فی الرجل یری المرأة فتعجبه)

جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو دیکھ لے اور اس کے حسن سے متاثر ہو تو اپنی بیوی کے پاس چلا جائے کیونکہ اس کے پاس بھی وہی ہے جو اس کے پاس تھا

ان تمام احکام و ہدایات سے شریعت کا منشا یہ ہے کہ صنفی انتشار کے تمام دروازے مسدود کیے جائیں، زوجی تعلقات کو دائرۂ ازدواج کے اندر محدود کیا جائے، اس دائرہ کے باہر جس حد تک ممکن ہو کسی قسم کی صنفی تحریکات نہ ہوں، اور جو تحریکات خود طبیعت کے اقتضاء یا اتفاقی حوادث سے پیدا ہوں ان کی تسکین کے لیے ایک مرکز بنا دیا جائے ـــــ عورت کے لیے اس کا شوہر اور مرد کے لیے اسکی بیوی ـــ اس طرح انسان تمام غیر طبعی اور خود ساختہ ہیجانات اور انتشار عمل سے بچ کر اپنی مجتمع قوت (Conservated energy) کے ساتھ نظام تمدن کی خدمت کرے، اور وہ صنفی محبت اور کشش کا مادّہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس کارخانے کو چلانے کے لیے ہر مرد و عورت میں پیدا کیا ہے، تمام تر ایک خاندان کی تخلیق اور اس کے استحکام میں صرف ہو۔ ازدواج ہر حیثیت سے پسندیدہ ہے کیونکہ وہ فطرت انسانی اور فطرت حیوانی دونوں کے منشا اور قانون الٰہی کے مقصد کو پورا کرتا ہے، اور ترک ازدواج ہر حیثیت سے ناپسندیدہ، کیونکہ وہ دو برائیوں میں سے ایک برائی کا حامل ضرور ہوگا، یا تو انسان قانون فطرت کے منشا کو پورا ہی نہ کرے گا اور اپنی قوتوں کو فطرت سے لڑنے میں ضائع کردیگا، یا پھر وہ اقتضائے طبیعت سے مجبور ہو کر غلط اور ناجائز طریقوں سے اپنی خواہشات کو پورا کرے گا۔

خاندان کی تنظیم صنفی میلان کو خاندان کی تخلیق اور اسکے استحکام کا ذریعہ بنانے کے بعد اسلام خاندان کی تنظیم کرتا ہے، اور یہاں بھی وہ پورے توازن کے ساتھ قانون فطرت کے اُن تمام پہلوؤں کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے جن کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ عورت اور مرد کے حقوق متعین کرنے میں جس درجہ عدل و انصاف اس نے ملحوظ رکھا ہے، اسکی تفصیلات میں نے ایک الگ مضمون میں بیان کی ہیں جو حقوق الزوجین کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اسکی طرف مراجعت کرنے سے آپکو معلوم ہو جائیگا کہ دونوں صنفوں میں جس حد تک مساوات قائم کی جا سکتی تھی وہ اسلام نے قائم کر دی ہے۔ لیکن اسلام اُس مساوات کا قائل نہیں ہے جو قانون فطرت کے خلاف ہو۔ انسان ہونے کی حیثیت سے جیسے حقوق مرد کے

ہیں ویسے ہی عورت کے ہیں۔ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ۔ لیکن زوج فاعل ہونے کی حیثیت سے جو ذاتی فضیلت (بمعنی عزت نہیں بلکہ بمعنی غلبہ و تقدم) مرد کو حاصل ہے، وہ اس نے پورے انصاف کے ساتھ مرد کو عطا کی ہے: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ: ۲۸) اس طرح عورت اور مرد میں فاضل اور مفضول کا فطری تعلق تسلیم کر کے اسلام نے خاندان کی تنظیم حسب ذیل قواعد پر کی ہے :-

مرد کی قوامیت خاندان میں مرد کی حیثیت قوام کی ہے، یعنی وہ خاندان کا حاکم ہے، محافظ ہے، اخلاق اور معاملات کا نگراں ہے، اسکی بیوی اور بچوں پر اسکی اطاعت فرض ہے (بشرطیکہ وہ اللہ اور رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دے)، اور اس پر خاندان کے لیے روزی کمانے اور ضروریات زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء: ۶)

مرد عورتوں پر قوام ہیں اُس فضیلت کی بنا پر جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر عطا کی ہے، اور اس بنا پر کہ وہ اُن پر (مہر و نفقہ کی صورت میں) اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

الرجل راعٍ علی اهله وهو مسئول (بخاری باب قوا انفسکم و اهلیکم ناراً - کتاب النکاح)

مرد اپنے بیوی بچوں پر حکمراں ہے اور اپنی رعیت میں اپنے عمل پر خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النساء: ۶)

صالح بیویاں شوہروں کی اطاعت گذار اور اللہ کی توفیق سے شوہروں کی غیر موجودگی میں ان کے ناموس کی محافظ ہیں۔

قَالَ النَّبِيُّ صلعم اذا خرجت المرأة

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب عورت اپنے

من بيتها وزوجها كاره لعنها كل ملك فى السماء وكل شيء مرت عليه غير الجن والانس حتى ترجع (كشف الغمہ)

شوہر کی مرضی کے خلاف گھر سے نکلتی ہے تو آسمان کا ہر فرشتہ اس پر لعنت بھیجتا ہے اور جن و انس کے سوا ہر وہ چیز جس پر سے وہ گزرتی ہے، اس پر پھٹکار بھیجتی ہے تاوقتیکہ وہ واپس نہ ہو۔

وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (النساء: ۶)

اور جن بیویوں سے تم کو سرکشی و نافرمانی کا خوف ہو اُن کو نصیحت کرو، (نہ مانیں تو) خوابگاہوں میں ان سے ترک تعلق کرو، (پھر بھی باز نہ آئیں تو) مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان پر زیادتی کرنے کے لیے کوئی بہانہ نہ نکالو۔

وقال النبى صلعم لا طاعة لمن لم يطع الله (رواه احمد من حديث معاذ) ولا طاعة فى معصية الله (رواه احمد من حديث عمران بن حصين) انما الطاعة فى المعروف (بخارى كتاب الاحكام)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص خدا کی اطاعت نہ کرے اسکی اطاعت نہ کی جائے۔ اللہ کی نافرمانی میں کسی شخص کی فرمانبرداری نہیں کی جاسکتی فرمانبرداری صرف امر معروف میں ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَاِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا (العنکبوت: ۲۹)

اور ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ ادب سے پیش آئے لیکن اگر وہ تجھکو حکم دیں کہ میرے ساتھ کوئی شریک ٹھیرائے جسکے لیے تیرے پاس کوئی دلیل ہی نہیں ہے تو اس باب میں ان کی اطاعت نہ کر۔

اس طرح خاندان کی تنظیم اس طور پر کی گئی ہے کہ اس کا ایک سردھرا اور صاحب امر ہو۔ جو شخص

اس نظم میں خلل ڈالنے کی کوشش کرے اس کے حق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وعید ہے کہ

من افسد امرأۃ علیٰ زوجھا — جو کوئی کسی عورت کے تعلقات اسکے شوہر سے خراب کرنیکی

فلیس منا (کشف الغمۃ) — کوشش کرے اس کا ہم سے کچھ تعلق نہیں۔

عورت کا دائرۂ عمل اس تنظیم میں عورت کو گھر کی ملکہ بنایا گیا ہے۔ کسب مال کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہے، اور اُس مال سے گھر کا انتظام کرنا اس کا کام ہے۔

المرأۃ راعیۃ علیٰ بیت زوجھا — عورت اپنے شوہر کے گھر کی حکمراں ہے اور وہ اپنی

وھی مسئولۃ۔ (بخاری باب قوا انفسکم واھلیکم ناراً) — حکومت کے دائرے میں اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہے۔

اُس کو ایسے تمام فرائض سے سبکدوش کیا گیا ہے جو بیرون خانہ کے امور سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً

- اس پر نماز جمعہ واجب نہیں (ابوداؤد۔ باب الجمعۃ للمملوک والمرأۃ)

اس پر جہاد بھی فرض نہیں اگرچہ بوقت ضرورت وہ مجاہدین کی خدمت کے لیے جا سکتی ہے جیساکہ آگے چل کر تحقیق بیان ہوگا۔

اس کے لیے جنازوں کی شرکت بھی ضروری نہیں بلکہ اس سے روکا گیا ہے (بخاری۔ باب اتباع النساء الجنازہ)

اس پر نماز باجماعت اور مسجدوں کی حاضری بھی لازم نہیں کی گئی۔ اگرچہ چند پابندیوں کے ساتھ مسجدوں میں آنے کی اجازت ضرور دی گئی ہے لیکن اس کو پسند نہیں کیا گیا (ابوداؤد۔ باب ما جاء فی خروج النساء الی المساجد)

اس کو محرم کے بغیر سفر کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ (ترمذی۔ باب ما جاء فی کراھیۃ ان تسافر المرأۃ وحدھا۔ وابوداؤد باب فی المرأۃ تحج بغیر محرم)

غرض ہر طریقہ سے عورت کے گھر سے نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور اس کے لیے قانون

اسلامی میں پسندیدہ صورت یہی ہے کہ وہ گھر میں رہے جیسا کہ آیت وَقَرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ ؎ کا صاف منشا ہے۔ لیکن اس باب میں زیادہ سختی اس لیے نہیں کی گئی کہ بعض حالات میں عورتوں کے لیے گھر سے نکلنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک عورت کا کوئی سر دھرا نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ محافظ خاندان کی مفلسی، قلت معاش، بیماری، معذوری یا اور ایسے ہی وجوہ سے عورت باہر کام کرنے پر مجبور ہو جائے۔ ایسی تمام صورتوں کے لیے قانون میں کافی گنجائش رکھی گئی ہے چنانچہ حدیث میں ہے:

؎ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے لیے خاص ہے کیونکہ آیت کی ابتدا یا نِسَاءَ النَّبِیِّ سے کی گئی ہے۔ لیکن اس پوری آیت میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں سے کونسی ہدایت ایسی ہے جو امہات مومنین کے ساتھ خاص ہو؟ فرمایا گیا ہے "اگر تم پرہیزگار ہو تو دبی زبان سے لگاوٹ کے انداز میں کسی سے بات نہ کرو تاکہ جس شخص کے دل میں کھوٹ ہو وہ تمہارے متعلق کچھ امیدیں اپنے دل میں نہ پال لے۔ جو بات کرو سیدھے سادھے انداز میں کرو۔ اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو۔ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار نہ کرتی پھرو۔ نماز پڑھو۔ زکوٰۃ دو۔ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور کر دے۔" ان ہدایات پر غور کیجیے۔ ان میں کونسی چیز ہے جو عام مسلمان عورتوں کے لیے نہیں ہے؟ کیا مسلمان عورتیں پرہیزگار نہ بنیں؟ کیا وہ غیر مردوں سے لگاوٹ کی باتیں کیا کریں؟ کیا وہ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار کرتی پھریں؟ کیا وہ نماز و زکوٰۃ اور اطاعت خدا و رسول سے انحراف کریں؟ کیا اللہ تعالیٰ ان کو گندگی میں رکھنا چاہتا ہے؟ اگر یہ سب ہدایات سب مسلمان عورتوں کے لیے عام ہیں تو صرف وَقَرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ ہی کو ازواج نبی کے لیے خاص کرنے کی کیا وجہ ہے؟

دراصل غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ آیت کی ابتدا میں لوگوں کو یہ الفاظ نظر آئے کہ "اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو"۔ لیکن یہ انداز بیان بالکل اس طرح کا ہے جیسے کسی شریف بچے سے کہا جائے کہ "تم کوئی عام بچوں کی طرح تو ہو نہیں کہ بازاروں میں پھرو اور بیہودہ حرکات کرو، تمہیں تمیز سے رہنا چاہیے"۔ ایسا کہنے سے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ دوسرے بچوں کے لیے بازاری پن اور بے ہودہ حرکات پسندیدہ ہیں اور خوش تمیزی ان کے حق میں مطلوب نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

فقد اذن اللہ لکن ان تخرجن — اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جائز رکھا ہے

لحوائجکن (بخاری- باب خروج النساء لحوائجھن — کہ تم اپنی ضروریات کے لیے گھر سے نکل سکتی ہو۔

وفی ھٰذا المعنی حدیث فی صحیح المسلم باب اباحۃ

الخروج للنساء لقضاء حاجۃ الانسان)

مگر اس قسم کی اجازت جو محض حالات اور ضروریات کی رعایت سے دی گئی ہے، اسلامی نظام معاشرت کے اس قاعدہ میں ترمیم نہیں کرتی کہ عورت کا دائرۂ عمل اس کا گھر ہے۔ یہ تو محض ایک وسعت اور رخصت ہے، اور اس کو اسی حیثیت میں رہنا چاہیے۔

ضروری پابندیاں بالغ عورت کو اپنے ذاتی معاملات میں کافی آزادی بخشی گئی ہے، مگر اس کو اس حد تک خود اختیاری عطا نہیں کی گئی جس حد تک بالغ مرد کو عطا کی گئی ہے۔ مثلاً:

مرد اپنے اختیار سے جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ لیکن عورت خواہ کنواری ہو یا شادی شدہ یا بیوہ، ہر حال میں ضرورت ہے کہ سفر میں اس کے ساتھ ایک محرم ہو۔

بقیہ صفحہ گذشتہ۔ بلکہ اس سے حسن اخلاق کا ایک معیار قائم کرنا مقصود ہوتا ہے تاکہ ہر وہ بچہ جو شریف بچوں کی طرح رہنا چاہتا ہو اس معیار پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ قرآن میں تو یہی طریق نصیحت اس لیے اختیار کیا گیا کہ عرب جاہلیت کی عورتوں میں ویسی ہی آزادی تھی جیسی اس وقت یورپ میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بتدریج انکو اسلامی تہذیب کا خوگر بنایا جا رہا تھا اور ان کے لیے اخلاقی حدود اور ضابطۂ معاشرت کی قیود مقرر کی جارہی تھیں۔ اس حالت میں امہات المومنین کی زندگی کو خاص طور پر منضبط کیا گیا تاکہ وہ دوسری عورتوں کے لیے نمونہ بن جائیں اور عام مسلمانوں کے گھروں میں ان کے طریقوں کی تقلید کی جائے۔

ٹھیک یہی رائے علامہ ابو بکر جصاص نے اپنی کتاب "احکام القرآن" میں ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "یہ حکم اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی بیویوں کے حق میں نازل ہوا ہے مگر اسکی مراد عام ہے جس میں آپ اور دوسرے سب مسلمان شریک ہیں کیونکہ ہم آپکی پیروی پر مامور ہیں اور وہ سب احکام جو آپ کے لیے نازل ہوئے ہیں، ہمارے لیے بھی ہیں بجز ان امور کے جنکے متعلق تصریح ہے کہ وہ آپ کے لیے خاص ہیں" (جلد سوم۔ صفحہ ۴۵۵)

لا یحل لامرأۃ تومن باللہ والیوم الآخر ان تسافر سفراً یکون ثلثۃ ایام فصاعداً الا ومعہا ابوہا او اخوہا او زوجہا او ابنہا او ذو محرم منہا۔	کسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو یہ حلال نہیں کہ وہ تین دن یا اس سے زیادہ کا سفر کرے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ اس کا باپ یا بھائی یا شوہر یا بیٹا یا کوئی اور محرم مرد ہو۔
وعن ابی ہریرۃ عن النبی صلعم انہ قال لا تسافر المرأۃ مسیرۃ یوم ولیلۃ الا ومعہا محرم۔ والعمل علی ہذا عند اہل العلم (ترمذی۔ باب ماجاء فی کراہیۃ ان تسافر المرأۃ وحدہا)	اور حضرت ابوہریرہ کی روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ہے کہ حضور نے فرمایا عورت ایک دن رات کا سفر نہ کرے جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی محرم مرد نہ ہو۔
وعن ابی ہریرۃ ایضاً انہ صلعم قال لا یحل لامرأۃ مسلمۃ تسافر مسیرۃ لیلۃ الا ومعہا رجل ذو حرمۃ منہا (ابو داؤد۔ باب فی المرأۃ تحج بغیر محرم)	اور حضرت ابوہریرہ سے یہ بھی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا کسی مسلمان عورت کے لیے حلال نہیں کہ ایک رات کا سفر کرے تاوقتیکہ اس کے ساتھ ایک محرم مرد نہ ہو۔

ان روایات میں جو اختلاف مقدار سفر کی تعیین میں ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دراصل ایک دن یا دو دن کا سوال اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ اہمیت صرف اس امر کی ہے کہ عورت کو تنہا نقل و حرکت کرنے کی ایسی آزادی نہ دی جائے جو موجب فتنہ ہو۔ اسی لیے حضورؐ نے مقدار سفر معین کرنے میں زیادہ اہتمام نہ فرمایا، اور مختلف حالات میں وقت اور موقع کی رعایت سے مختلف مقداریں ارشاد فرمائیں۔

مرد کو اپنے نکاح کے معاملہ میں پوری آزادی حاصل ہے۔ مسلمان یا کتابیہ عورتوں میں سے جس کے ساتھ چاہے وہ نکاح کر سکتا ہے، اور لونڈی بھی رکھ سکتا ہے۔ لیکن عورت اس معاملہ میں کلیتہً خود مختار نہیں ہے۔ وہ کسی غیر مسلم سے نکاح نہیں کر سکتی:۔

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ (الممتحنہ: ۲) نہ یہ اُن کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ اِن کے لیے حلال۔

وہ اپنے غلام سے بھی تمتع نہیں کر سکتی۔ قرآن میں جس طرح مرد کو لونڈی سے تمتع کی اجازت دی گئی ہے اُس طرح عورت کو نہیں دی گئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک عورت نے ما ملکت ایمانکم کی غلط تاویل کر کے اپنے غلام سے تمتع کیا تھا۔ آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے یہ معاملہ صحابہ کی مجلس شوریٰ میں پیش کیا اور سب نے بالاتفاق فتویٰ دیا کہ قبحها الله تأولت كتاب الله غير تاويله (اس نے کتاب اللہ کو غلط معنی پہنائے) ایک عورت نے حضرت عمرؓ سے ایسے ہی ایک فعل کی اجازت مانگی تو آپ نے اس کو سخت سزا دی اور فرمایا لن تزال العرب بخير ما منعت نساؤها۔ یعنی عرب کی بھلائی اسی وقت تک ہے جب تک اس کی عورتیں محفوظ ہیں۔ (کشف الغمۃ للشعرانی)

غلام اور کافر کو چھوڑ کر "احرار اسلام" میں سے عورت اپنے لیے شوہر کا انتخاب کر سکتی ہے، لیکن اس معاملہ میں بھی اس کے لیے اپنے باپ، دادا، بھائی اور دوسرے اولیاء کی رائے کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ اولیاء کو یہ حق نہیں کہ عورت کی مرضی کے خلاف کسی سے اس کا نکاح کر دیں، کیونکہ ارشاد نبوی ہے کہ الايم احق بنفسها من وليها[1] اور لا تنكح البكر حتى تستاذن[2]۔ مگر عورت کے لیے بھی یہ مناسب نہیں کہ اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کی رائے

[1] لڑکی اپنے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق اپنے ولی سے زیادہ رکھتی ہے۔
[2] باکرہ لڑکی کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے اجازت نہ لے لی جائے۔

کے خلاف جس کے ساتھ چاہے نکاح کرلے۔ اسی لیے قرآن مجید میں جہاں مرد کے نکاح کا ذکر ہے وہاں نَکَحَ یَنْکِحُ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی خود نکاح کرلینے کے ہیں، مثلاً وَلَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکَاتِ "مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو"۔ اور فَانْکِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ "ان سے ان کے گھروالوں کی اجازت سے کر نکاح کرلو"۔ مگر جہاں عورت کے نکاح کا ذکر آیا ہے وہاں باب افعال سے اِنکاح کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی نکاح کردینے کے ہیں مثلاً وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ (النور : ۴) "اپنی بے شوہر عورتوں کے نکاح کردو"۔ اور وَلَا تُنْکِحُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَتّٰی یُؤْمِنُوْا (بقرہ : ۲۷) "اپنی عورتوں کے نکاح مشرکین سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح شادی شدہ عورت اپنے شوہر کی تابع ہے اسی طرح غیر شادی شدہ عورت اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کی تابع ہے، اور تابعیت اس معنی میں نہیں ہے کہ اس کے لیے ارادہ و عمل کی کوئی آزادی نہیں، یا اپنے معاملہ میں کوئی اختیار نہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ نظام معاشرت کو اختلال و برہمی سے محفوظ رکھنے اور خاندان کے اخلاق و معاملات کو اندرونی و بیرونی فتنوں سے بچانے کی ذمہ داری مرد پر ہے، اور اس نظم کی خاطر عورت پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ جو شخص اس نظم کا ذمہ دار ہو اُس کی اطاعت کرے، خواہ وہ اس کا شوہر ہو، یا باپ یا بھائی۔

عورت کے حقوق اس طرح اسلام نے بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ کو ایک فطری حقیقت تسلیم کرنے کے ساتھ ہی لِلرِّجَالِ عَلَیْھِنَّ دَرَجَۃٌ کی بھی ٹھیک ٹھیک تعیین کردی ہے۔ عورت اور مرد میں حیاتیات اور نفسیات کے اعتبار سے جو فرق ہے اسکو وہ بعینہٖ قبول کرتا ہے، جتنا فرق ہے اُسے جوں کا توں برقرار رکھتا ہے، اور جیسا فرق ہے اسی

کے لحاظ سے ان کے مراتب اور وظائف مقرر کرتا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم سوال عورت کے حقوق کا ہے۔ ان حقوق کی تعیین میں اسلام نے تین باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔

ایک یہ کہ مرد کو جو حاکمانہ اختیارات محض خاندان کے نظم کی خاطر دیے گئے ہیں اُن سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ ظلم نہ کر سکے، اور ایسا نہ ہو کہ تابع و متبوع کا تعلق عملاً لونڈی اور آقا کا تعلق بن جائے۔

دوسرے یہ کہ عورت کو ایسے تمام مواقع بہم پہنچائے جائیں جن سے فائدہ اٹھا کر وہ نظام معاشرت کے حدود میں اپنی فطری صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے اور تعمیر تمدن میں اپنے حصے کا کام بہتر سے بہتر انجام دے سکے۔

تیسرے یہ کہ عورت کے لیے ترقی اور کامیابی کے بلند سے بلند درجوں تک پہنچنا ممکن ہو، مگر اس کی ترقی اور کامیابی جو کچھ بھی ہو عورت ہونے کی حیثیت سے ہو۔ مرد بننا نہ تو اس کا حق ہے، نہ مردانہ زندگی کے لیے اس کو تیار کرنا اس کے اور نظام تمدن کے لیے مفید ہے، اور نہ مردانہ زندگی میں وہ کامیاب ہو سکتی ہے۔

مذکورۂ بالا تینوں امور کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھ کر اسلام نے عورتوں کو جیسے وسیع تمدنی و معاشی حقوق دیے ہیں، اور عزّت و شرف کے جو بلند مراتب عطا کیے ہیں، اور ان حقوق و مراتب کی حفاظت کے لیے اپنی اخلاقی اور قانونی ہدایات میں جیسی پائدار ضمانتیں مہیا کی ہیں ان کی نظیر دنیا کے کسی قدیم و جدید نظام معاشرت میں نہیں ملتی۔

معاشی حقوق سب سے اہم اور ضروری چیز جس کی بدولت تمدن میں انسان کی منزلت قائم ہوتی ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ اپنی منزلت کو برقرار رکھتا ہے، وہ اُس کی معاشی حیثیت کی مضبوطی ہے

اسلام کے سوا تمام قوانین نے عورت کو معاشی حیثیت سے کمزور کیا ہے اور یہی معاشی بے بسی معاشرت میں عورت کی غلامی کا سب سے بڑا سبب بنی ہے۔ یورپ نے اس حالت کو بدلنا چاہا، مگر اس طرح کہ عورت کو ایک کمانے والا فرد بنا دیا۔ یہ ایک دوسری عظیم تر خرابی کا سبب بن گیا۔ اسلام بیچ کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ عورت کو وراثت کے نہایت وسیع حقوق دیتا ہے۔ باپ سے، شوہر سے، اولاد سے اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے اسکو وراثت ملتی ہے[1]۔ نیز شوہر سے اسکو مہر بھی ملتا ہے اور ان تمام ذرائع سے جو کچھ مال اس کو پہنچتا ہے اس میں ملکیت اور قبض و تصرف کے پورے حقوق اسے دیے گئے ہیں جن میں مداخلت کرنے کا اختیار نہ اُس کے باپ کو حاصل ہے، نہ شوہر کو، نہ کسی اور کو۔ مزید برآں اگر وہ کسی تجارت میں روپیہ لگا کر، یا خود محنت کر کے کچھ کمائے تو اسکی مالک بھی کلیتہً وہی ہے۔ اور ان سب کے باوجود اُس کا نفقہ ہر حال میں اسکے شوہر پر واجب ہے۔ بیوی خواہ کتنی ہی مالدار ہو، اُس کا شوہر اس کے نفقہ سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح اسلام میں عورت کی معاشی حیثیت اتنی مستحکم ہو گئی ہے کہ بسا اوقات وہ مرد سے زیادہ بہتر حال میں ہوتی ہے۔

تمدنی حقوق (۱) عورت کو شوہر کے انتخاب کا پورا حق دیا گیا ہے۔ اسکی مرضی کے خلاف یا اسکی رضامندی کے بغیر کوئی شخص اسکا نکاح نہیں کر سکتا۔ اور اگر وہ خود اپنی مرضی سے کسی مسلم کے ساتھ نکاح کرے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ البتہ اگر اسکی نظر انتخاب کسی ایسے شخص پر پڑے جو اس کے خاندان کے مرتبہ سے گرا ہوا ہو (Social status) تو صرف اس صورت میں اس کے اولیاء کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔

[1] وراثت میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلہ میں نصف رکھا گیا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ عورت کو نفقہ اور مہر کے حقوق حاصل ہیں جن سے مرد محروم ہے۔ عورت کا نفقہ صرف اسکے شوہر ہی پر واجب نہیں ہے، بلکہ شوہر نہ ہونیکی صورت میں باپ بھائی بیٹے یا دوسرے اولیاء پر اسکی کفالت واجب ہوتی ہے۔ پس جب عورت پر وہ ذمہ داریاں نہیں ہیں جو مرد پر ہیں، تو وراثت میں اس کا حصہ بھی نہ ہونا چاہیے جو مرد کا ہے۔

(۲) ایک ناپسندیدہ یا ظالم یا ناکارہ شوہر کے مقابلہ میں عورت کو خلع اور فسخ و تفریق کے وسیع حقوق دیے گئے ہیں۔

(۳) شوہر کو بیوی پر جو اختیارات اسلام نے عطا کیے ہیں ان کے استعمال میں حسن سلوک اور فیاضانہ برتاؤ کی ہدایت کی گئی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو)۔ اور وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ۔ (اور آپس کے تعلقات میں فیاضی کو نہ بھول جاؤ)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے خیارکم خیارکم لنساءھم والطفھم باھلہ (تم میں اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھے ہیں اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ لطف اور مہربانی کا سلوک کرنے والے ہیں)۔ یہ محض اخلاقی ہدایات ہی نہیں ہیں۔ اگر شوہر اپنے اختیارات کے استعمال میں ظلم سے کام لے تو عورت کو قانون سے مدد لینے کا حق حاصل ہے۔

(۴) بیوہ اور مطلقہ عورتوں اور ایسی تمام عورتوں کو جنکے نکاح ازروئے قانون فسخ کیے گئے ہوں یا جنکو حکم تفریق کے ذریعہ سے شوہر سے جدا کیا گیا ہو نکاح ثانی کا غیر مشروط حق دیا گیا ہے اور اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے کہ اُن پر شوہر سابق یا اس کے کسی رشتہ دار کا کوئی حق باقی نہیں۔ یہ وہ حق ہے جو آج تک یورپ اور امریکہ کے بیشتر ممالک میں بھی عورت کو نہیں ملا ہے۔

(۵) دیوانی اور فوجداری کے قوانین میں عورت اور مرد کے درمیان کامل مساوات قائم کی گئی ہے۔ جان و مال اور عزت کے تحفظ میں اسلامی قانون عورت اور مرد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں کرتا۔

عورتوں کی تعلیم | عورتوں کو دینی اور دنیوی علوم سیکھنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے بلکہ انکی تعلیم و تربیت کو اُسی قدر ضروری قرار دیا گیا ہے جس قدر مردوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و اخلاق کی تعلیم جس طرح مرد حاصل کرتے تھے اسی طرح عورتیں بھی کرتی تھیں۔ آپ نے ان کے لیے اوقات معین

فرمادیے تھے جن میں وہ آپ سے علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ آپکی ازواج مطہرات، اور خصوصاً حضرت عایشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نہ صرف عورتوں کی، بلکہ مردوں کی بھی معلمہ تھیں اور بڑے بڑے صحابہ و تابعین اُن سے حدیث تفسیر اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اشراف تو درکنار، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں تک کو علم اور ادب سکھانے کا حکم دیا تھا، چنانچہ حضور کا ارشاد ہے کہ

ایما رجل کانت عندہ ولیدۃ فعلمہا	جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اسکو خوب
فاحسن تعلیمہا وادبہا فاحسن تادیبہا	تعلیم دے اور عمدہ تہذیب و شایستگی سکھائے، پھر اس کو
ثم اعتقہا وتزوجہا فلہ اجران (بخاری کتاب النکاح)	آزاد کرکے اس سے شادی کرلے اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔

پس جہاں تک نفس تعلیم و تربیت کا تعلق ہے، اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے۔ البتہ نوعیت میں فرق ضروری ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی صحیح تعلیم و تربیت وہ ہے جو اسکو ایک بہترین بیوی، بہترین ماں اور بہترین گھروالی بنائے۔ اس کا دائرۂ عمل گھر ہے اس لیے خصوصیت کے ساتھ اسکو ان علوم کی تعلیم دی جانی چاہیے جو اس دائرے میں اُسے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکتے ہوں۔ مزید برآں وہ علوم بھی اس کے لیے ضروری ہیں جو انسان کو انسان بنانے والے اور اسکے اخلاق کو سنوارنے والے اور اسکی نظر کو وسیع کرنے والے ہیں۔ ایسے علوم اور ایسی تربیت سے آراستہ ہونا ہر مسلمان عورت کے لیے لازم ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی عورت غیر معمولی عقلی و ذہنی استعداد رکھتی ہو، اور ان علوم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنا چاہے تو اسلام اسکی راہ میں مزاحم نہیں ہے، بشرطیکہ وہ اُن حدود سے تجاوز نہ کرے جو شریعت نے عورتوں کے لیے مقرر کیے ہیں۔

عورت کا اصلی اٹھان (emancipation) یہ تو صرف حقوق کا ذکر ہے۔ مگر اس سے اس احسان عظیم کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو اسلام نے عورت پر کیا ہے۔ انسانی تمدن کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ عورت کا وجود دنیا میں ذلت، شرم اور گناہ کا وجود تھا۔ بیٹی کی پیدائش باپ کے لیے سخت عیب اور موجب ننگ و عار تھی۔ سسرالی رشتے ذلیل

رشتے سمجھے جاتے تھے، حتیٰ کہ سسر اور سالے کے الفاظ اُسی جاہلی تخیل کے تحت آج تک گالی کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ بہت سی قوموں میں اسی ذلت سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو قتل کر دینے کا رواج ہو گیا تھا۔[1] جہلا تو درکنار علما اور پیشوایان مذاہب تک میں مدتوں یہ سوال زیر بحث رہا کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں؟ اور خدا نے اسکو روح بخشی ہے یا نہیں؟ ہندو مذہب میں ویدوں کی تعلیم کا دروازہ عورت کے لیے بند تھا۔ بودھ مت میں عورت سے تعلق رکھنے والے کے لیے نروان کی کوئی صورت نہ تھی۔ مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں عورت ہی انسانی گناہ کی بانی مبانی اور ذمہ دار تھی۔ یونان میں گھر والیوں کے لیے نہ علم تھا نہ تہذیب، ثقافت تھی اور نہ حقوق مدنیت۔ یہ چیزیں جس عورت کو ملتی تھیں وہ رنڈی ہوتی تھی۔ روم اور ایران اور چین اور مصر اور تہذیب انسانی کے دوسرے مرکزوں کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ صدیوں کی مظلومی و محکومی اور عالمگیر حقارت کے برتاؤ نے خود عورت کے ذہن سے بھی عزتِ نفس کا احساس مٹا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس امر کو بھول گئی تھی کہ دنیا میں وہ کوئی حق لے کر پیدا ہوئی ہے یا اس کے لیے بھی عزت کا کوئی مقام ہے۔ مرد اس پر ظلم و ستم کرنا اپنا حق سمجھتا تھا اور وہ اس ظلم کو سہنا اپنا فرض جانتی تھی۔ غلامانہ ذہنیت اس حد تک اس میں پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپکو شوہر کی "داسی" کہتی تھی، "پتی ورتا" اس کا دھرم تھا، اور پتی ورتا کے معنی یہ تھے کہ شوہر اس کا معبود اور دیوتا ہے۔

[1] قرآن اس جاہلی ذہنیت کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کرتا ہے:۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ (النحل: ۷)

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اُس کے چہرہ پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ زہر کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خبر سے جو شرم کا داغ اس کو لگ گیا ہے اس کے باعث لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہوں یا مٹی میں دبا دوں۔

اس ماحول میں جس نے نہ صرف قانونی اور عملی حیثیت سے بلکہ ذہنی حیثیت سے بھی ایک انقلاب عظیم برپا کیا وہ اسلام ہے اسلام ہی نے عورت اور مرد دونوں کی ذہنیتوں کو بدلا ہے۔ عورت کی عزت اور اسکے حق کا تخیل ہی انسان کے دماغ میں اسلام کا پیدا کیا ہوا ہے۔ آج حقوق نسواں اور تعلیم نسواں اور بیداری اناث کے جو الفاظ آپ سن رہے ہیں، یہ سب اُسی انقلاب انگیز صدا کی بازگشت ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بلند ہوئی تھی، اور جس نے افکار انسانی کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنہوں نے دنیا کو بتایا کہ عورت بھی ویسی ہی انسان ہے جیسا مرد ہے۔

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النساء-۱) اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اسکے جوڑے کو پیدا کیا۔

خدا کی نگاہ میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء-۵) مرد جیسے عمل کریں ان کا پھل وہ پائینگے اور عورتیں جیسے عمل کریں ان کا پھل وہ پائینگی۔

ایمان اور عمل صالح کے ساتھ روحانی ترقی کے جو درجات مرد کو مل سکتے ہیں وہی عورت کے لیے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ مرد اگر ابراہیم ادہم بن سکتا ہے تو عورت کو بھی رابعہ بصریہ بننے سے کوئی شے نہیں روک سکتی ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ (آل عمران-۲۰) انکے رب نے انکی دعا کے جواب میں فرمایا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہ کروں گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے کی جنس سے ہو۔

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا (النساء-۱۸) اور جو کوئی بھی نیک عمل کریگا، خواہ مرد ہو یا عورت، مگر ہو ایمان دار، تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہونگے اور ان پر رتی برابر ظلم نہ ہوگا۔

پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، جنہوں نے مرد کو بھی خبردار کیا، اور عورت میں بھی یہ احساس پیدا کیا کہ جیسے حقوق عورت پر مرد کے ہیں ویسے ہی مرد پر عورت کے ہیں۔

لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ (البقرہ - ۲۸) عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اسکے حقوق بھی ہیں۔

پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جس نے ذلت اور عار کے مقام سے اٹھا کر عورت کو عزت کے مقام پر پہنچایا۔ وہ حضور ہی ہیں جنہوں نے باپ کو بتایا کہ بیٹی کا وجود تیرے لیے ننگ نہیں ہے بلکہ اس کی پرورش اور اس کی حق رسانی تجھے جنت کا مستحق بناتی ہے۔

من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیامة انا وهو ضم اصابعه (مسلم - کتاب البر والصلة والادب)

جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہنچ گئیں، تو قیامت کے روز میں اور وہ اس طرح آئیں گے جیسے میرے ہاتھ کی یہ دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہیں۔

من ابتلی من البنات بشیء فاحسن الیهن کن له سترا من النار (مسلم کتاب مذکور)

جسکے ہاں لڑکیاں پیدا ہوں اور وہ اچھی طرح انکی پرورش کرے تو یہی لڑکیاں اسکے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔

حضور ہی نے شوہر کو بتایا کہ نیک بیوی تیرے لیے دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے۔

خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة (نسائی کتاب النکاح)

دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک بیوی ہے۔

حبب الی من الدنیا النساء والطیب و جعل قرة عینی فی الصلوٰة (نسائی کتاب عشرة النساء)

دنیا کی چیزوں میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب عورت اور خوشبو ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

لیس من متاع الدنیا شیء افضل من المرأة الصالحة (ابن ماجہ - کتاب النکاح)

دنیا کی نعمتوں میں کوئی چیز نیک بیوی سے بہتر نہیں ہے۔

حضور ہی نے بیٹے کو بتایا کہ خدا اور رسول کے بعد سب سے زیادہ عزت اور قدر و منزلت اور حسن سلوک کی مستحق تیری ماں ہے۔

سأل رجل یا رسول اللہ من احق بحسن صحابتی قال امک قال ثم من قال امک قال ثم من قال امک قال ثم من قال ابوک۔ (بخاری کتاب الادب)

ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ مجھ پر حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ فرمایا تیری ماں کا۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیرا باپ۔

ان اللہ حرم علیکم عقوق الامهات۔ (بخاری - کتاب الادب)

اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور حق تلفی حرام کر دی ہے۔

حضور ہی نے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ جذبات کی فراوانی، اور حسیات کی نزاکت، اور انتہا پسندی کی جانب میل و انعطاف عورت کی فطرت میں ہے۔ اسی فطرت پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اور یہ انوثت کے لیے عیب نہیں اس کا حسن ہے۔ تم اس سے جو کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو اس فطرۃ پر قائم رکھ کر ہی اٹھا سکتے ہو۔ اگر اس کو مردوں کی طرح سیدھا اور سخت بنانے کی کوشش کرو گے تو اسے توڑ دو گے

المرأۃ کالضلع ان اقمتہا کسرتہا وان استمتعت بہا استمتعت بہا و فیہا عوج
(بخاری - باب مداراۃ النساء)

اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ پہلے اور درحقیقت آخری شخص ہیں جنھوں نے عورت کی نسبت نہ صرف مرد کی، بلکہ خود عورت کی اپنی ذہنیت کو بھی بدل دیا اور جاہلی ذہنیت کی جگہ ایک نہایت صحیح ذہنیت پیدا کی جس کی بنیاد جذبات پر نہیں بلکہ خالص عقل اور علم پر تھی۔ پھر آپ نے باطنی اصلاح ہی پر اکتفا نہ فرمائی بلکہ قانون کے ذریعہ سے عورتوں کے حقوق کی حفاظت، اور مردوں کے ظلم کی روک تھام کا بھی انتظام کیا اور عورتوں میں اتنی بیداری پیدا کی کہ وہ اپنے جائز حقوق کو سمجھیں اور ان کی حفاظت کے لیے قانون سے مدد لیں۔

سرکار رسالت مآب کی ذات میں عورتوں کو ایک ایسا رحیم و شفیق حامی اور ایسا زبردست محافظ مل گیا تھا کہ اگر ان پر ذرا سی بھی زیادتی ہوتی تو وہ شکایت لے کر بے تکلف حضور کے پاس دوڑ جاتی تھیں، اور مرد اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں انکی بیویوں کو آنحضرت تک شکایت لے جانیکا موقع نہ مل جائے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر کا بیان ہے کہ جب تک حضور زندہ رہے ہم اپنی عورتوں سے بات کرنے میں احتیاط کرتے تھے کہ مبادا ہمارے حق میں کوئی حکم نازل نہ ہو جائے۔ جب حضور نے وفات پائی تب ہم نے کھل کر بات کرنی شروع کی (بخاری باب الوصاۃ بالنساء)۔

ابن ماجہ میں ہے کہ حضور نے بیویوں پر دست درازی کرنے کی عام ممانعت فرما دی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عمر نے شکایت کی کہ عورتیں بہت شوخ ہو گئی ہیں، ان کو مطیع کرنے کے لیے مارنے کی

اجازت ہونی چاہیے۔ آپ نے اجازت دیدی۔ لوگ نہ معلوم کب سے بھرے بیٹھے تھے۔ جس روز اجازت ملی اسی روز ستر عورتیں اپنے گھروں میں بیٹھ گئیں۔ دوسرے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر فریادی عورتوں کا ہجوم ہوگیا۔ سرکار نے لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا، خطبہ دینے کھڑے ہوئے، اور فرمایا۔

لقد طاف اللیلۃ بآل محمد سبعون امرأۃ — آج محمدؐ کے گھروالوں کے پاس ستر عورتوں نے چکر لگایا ہے

کل امرأۃ تشتکی زوجھا فلا تجدون اولئک — ہر عورت اپنے شوہر کی شکایت کر رہی تھی۔ جن لوگوں نے

خیارکم۔ — یہ حرکت کی ہے وہ تم میں ہرگز اچھے لوگ نہیں ہیں۔

اسی اخلاقی اور قانونی اصلاح کا نتیجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں عورت کو وہ بلند حیثیت حاصل ہوئی جسکی نظیر دنیا کی کسی سوسائٹی میں نہیں پائی جاتی۔ مسلمان عورت دنیا اور دین میں مادّی، عقلی اور روحانی حیثیات سے عزت اور ترقی کے اُن بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے جن تک مرد پہنچ سکتا ہے، اور اُس کا عورت ہونا کسی مرتبہ میں بھی اسکی راہ میں حائل نہیں ہے۔ آج اِس بیسویں صدی میں بھی دنیا اسلام سے بہت پیچھے ہے۔ افکارِ انسانی کا ارتقاء اب بھی اُس مقام تک نہیں پہنچا ہے جس پر اسلام پہنچا ہے۔ مغرب نے عورت کو جو کچھ دیا ہے عورت کی حیثیت سے نہیں دیا بلکہ مرد بنا کر دیا ہے۔ عورت درحقیقت اب بھی اُسکی نگاہ میں ویسی ہی ذلیل ہے جیسی پرانے دورِ جاہلیت میں تھی۔ گھر کی ملکہ، شوہر کی بیوی، بچوں کی ماں، ایک اصلی اور حقیقی عورت کے لیے اب بھی کوئی عزت نہیں۔ عزت اگر ہے تو اُس مردِ مؤنث کے لیے ہے جو جسمانی حیثیت سے تو عورت مگر دماغی اور ذہنی حیثیت سے مرد ہو اور تمدن و معاشرت میں مرد ہی کا کام کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ انوثت کی عزت نہیں، رجولیت کی عزت ہے۔ پھر پستی اور دنائت کے احساس (Inferiority complex) کا کھلا ہوا مظاہرہ یہ ہے کہ مغربی عورت مردانہ لباس فخر کے ساتھ پہنتی ہے، حالانکہ کوئی مرد زنانہ لباس پہنکر برسرِ عام آنے کا خیال بھی نہیں کرسکتا۔ بیوی بننا لاکھوں مغربی عورتوں کے نزدیک موجبِ ذلت ہے، حالانکہ شوہر بننا کسی مرد کے نزدیک ذلت کا موجب نہیں۔ مردانہ کام کرنے میں عورتیں عزت محسوس کرتی ہیں، حالانکہ خانہ داری

اور پرورش اطفال جیسے خالص زنانہ کاموں میں کوئی مرد عزت محسوس نہیں کرتا۔ پس بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مغرب نے عورت کو بحیثیت عورت ہونے کے کوئی عزت نہیں دی ہے۔ یہ کام اسلام اور صرف اسلام نے کیا ہے کہ عورت کو تمدن و معاشرت میں اُسکے فطری مقام ہی پر رکھ کر عزت و شرف کا مرتبہ عطا کیا، اور صحیح معنوں میں انوثت کے درجہ کو بلند کر دیا۔ اسلامی تمدن عورت کو عورت اور مرد کو مرد رکھ کر دونوں سے الگ الگ وہی کام لیتا ہے جسکے لیے فطرت نے اسکو بنایا ہے، اور پھر ہر ایک کو اسکی جگہ پر ہی رکھتے ہوئے عزت اور ترقی اور کامیابی کے یکساں مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ اُسکی نگاہ میں انوثت اور رجولیت دونوں انسانیت کے ضروری اجزا ہیں۔ تعمیر تمدن کے لیے دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔ دونوں اپنے اپنے دائرے میں جو خدمات انجام دیتے ہیں وہ یکساں مفید اور یکساں قدر کے مستحق ہیں۔ نہ رجولیت میں کوئی شرف ہے نہ انوثت میں کوئی ذلت۔ جس طرح مرد کے لیے عزت اور ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ مرد رہے اور مردانہ خدمات انجام دے، اُسی طرح عورت کے لیے بھی عزت اور ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ عورت رہے اور زنانہ خدمات انجام دے۔ ایک صالح نظام تمدن کا کام یہی ہے کہ وہ عورت کو اس کے فطری دائرۂ عمل میں رکھ کر پورے انسانی حقوق دے، عزت اور شرف عطا کرے، تعلیم و تربیت سے اسکی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو چمکائے اور اسی دائرے میں اس کے لیے ترقیوں اور کامیابیوں کی راہیں کھولے۔

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام

مختصر فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اِس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیمِ جہاد کِن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظامِ تمدن میں روحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار- دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اِس امر کی تحقیق کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

۵- قوانینِ جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں- جنگ کے متعلق ہندو مذہب بودھ مت یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید- بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ- قیمت مجلد ۵؎ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات

یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے- اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے- مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے- اِسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اِس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں- نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں- کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اِس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰ محصولڈاک ۲ خرچ وی پی ۳

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

سوہنی و تصاویر پرنٹنگ پریس ... لاہور میں طبع ہوئے

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

مینیجر

نرخنامہ و قواعد اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عہ ۱۰	عہ ۲۵	للعہ ۴۵	لہ ۸۰
نصف صفحہ	ے ۶	عہ ۱۵	عہ ۲۵	للعہ ۴۵
ربع صفحہ	للعہ ۴	عہ ۱۰	معہ ۱۷	عہ ۲۵

۱۔ کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳۔ صرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴۔ نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵۔ ٹائیٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔